آئینہ کشمیر

(ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ)

ڈاکٹر صابر آفاقی

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجرانِ کتب
سرینگر کشمیر

آئینہ کشمیر

(ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ)

ڈاکٹر صابر آفاقی

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجرانِ کتب
سرینگر کشمیر

آئینۂ کشمیر

(ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ)

ڈاکٹر صابر آفاقی

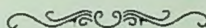
شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجرانِ کتب
مدینہ چوک، گاؤ کدل، سرینگر
ریزیڈنسی روڈ سرینگر، کشمیر

نام کتاب	:	آئینہ کشمیر
مصنف	:	ڈاکٹر صابر آفاقی
سنہ اشاعت	:	۲۰۱۶ء
صفحات	:	۱۶۰
تعداد	:	۱۱۰۰
زیرِ اہتمام	:	شیخ اعجاز احمد

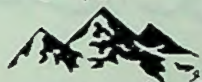
پبلشر

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجرانِ کتب

مدینہ چوک، گاؤ کدل، سرینگر کشمیر



تقسیم کار



گلشن بکس

ریزیڈنسی روڈ سرینگر، کشمیر

www.gulshanbooks.com

ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اُن کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی ہو تو ازراہ کرم مطلع فرماویں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (پبلشر)

انتساب

مورخ کشمیر جی۔ایم میر کے نام

فہرست

تعارف

بعض حادثے آدمی سے کوئی بڑا نیک کام کروا ڈالتے ہیں۔ ۸ اکتوبر کے زلزلے نے مظفرآباد کو تہہ و بالا کر دیا تو مجھے وہاں سے ہجرت کر کے راولپنڈی میں پناہ لینی پڑی میری زندگی کا یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ غم روزگار کے ساتھ ساتھ فکر نان ونفقہ دامن گیر ہوا تو مولانا عبدالعزیز مرحوم کے فرزند جناب عبدالحفیظ سینئر پروڈیوسر ''صبح پاکستان'' نے مجھے یوں سہارا دیا کہ مجھے فروری ۲۰۰۶ء ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے مقبول عام پروگرام ''صبح پاکستان'' میں بک کر لیا۔ چنانچہ میں جنت نظیر کشمیر کے جغرافیائی تاریخی، تمدنی، مذہبی، ثقافتی اور ادبی پہلو پر آٹھ دس تقریریں لکھ کر لے جاتا اور جناب عبدالحفیظ اپنی نگرانی میں تقریریں ریکارڈ کروا لیتے اور باری باری نشر کرتے ''صبح پاکستان'' کا یہ پروگرام پاکستان کی تمام نشرگاہیں ریلے کیا کرتی تھیں۔

یہ تقریریں بے حد پسند کی گئیں اور خطوط کے ذریعے سامعین بل من مزید کی فرمائش کرتے رہے۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک چلتا رہا اور جون ۲۰۰۶ء میں میرے مظفرآباد آنے پر اختتام پذیر ہوا۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ میرے بغیر آج تک کشمیر کے موضوع پر کسی شخص نے اتنی تقریریں ریڈیو سے نشر نہیں کی ہوں گی اور نہ ہی کسی ریڈیو اسٹیشن نے اس تسلسل کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کی ہوں گی۔ یہ کریڈٹ جناب عبدالحفیظ کو اور ریڈیو پاکستان اسلام آباد کو جاتا ہے کہ مجھ سے اتنی متنوع تقاریر لکھوائی گئیں ان تقریروں میں سیاست کو چھوڑ کر باقی اہم موضوعات پر آپ کو اچھا مواد نہایت سلیس زبان میں مل جائے گا، چونکہ ریڈیو کی اپنی ضروریات اور تقاضے ہوتے ہیں سو میں نے ان تقاضوں کے مطابق بات کہنے کی کوشش کی ہے۔

مکتبہ جمال کے مالک اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے عاشق جناب میاں مختار احمد کھٹانہ صاحب معروف ناشر اور صاحب ذوق اہل وطن ہیں۔ انہوں نے چند برسوں کے دوران امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی درجنوں کتابیں زیور طبع سے آراستہ کیں اور یوں اہل تحقیق کو

ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ میاں صاحب نے مولانا آزاد کو بالکل نئے زاویے سے پیش کرنے کی سعی مشکور فرمائی۔ اب تو مکتبہ جمال اور مولانا ابوالکلام آزاد لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں اسے نیک شگون ہی کہوں گا کہ اب جناب میاں مختار احمد کھٹانہ صاحب خاکسار کی ان تقاریر کو محبان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک بڑا اعزاز ہے اور اصحاب ذوق وجستجو کی خدمت میں نیک یادگار تحفہ!

صابر آفاقی

مظفرآباد

۱۹ جون ۲۰۰۹ء

پیش لفظ

۲۰۰۵ء کے اکتوبر کی ایک سرد صبح میں ریڈیو پاکستان کے قومی نشریاتی رابطے پر پیش کیے جانے والے پروگرام ''صبح پاکستان'' سے فارغ ہو کر اسلام آباد کے ڈیوٹی روم میں بیٹھا اگلے دن کے پروگرام کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا کہ آٹھ بج کر اکاون منٹ پر ہماری کوہ پیکر عمارت لرزنے لگی۔ سب لوگ دفتر سے باہر وسیع و عریض لان میں آ گئے۔ ہر ایک کے چہرے سے خوف ہویدا تھا اور ہر ایک کے لبوں پر اور آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا کہ زمین کیوں لرز اٹھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد معلوم ہوا کہ اسلام آباد میں مارگلہ ٹاورز زمین بوس ہو گیا ہے اور درجنوں لوگ موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں۔ میرے سٹیشن ڈائریکٹر جناب مجتبیٰ عامر نے مجھے بذات خود اس سانحے کی کوریج کے لیے کہا۔ میں اپنی او۔ بی۔ ٹیم کے ساتھ وہاں کس طرح پہنچا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ وہاں میں نے زعمائے قوم کے انٹرویوز کیے۔ مولانا فضل الرحمن نے اپنے تاثرات میں بتایا کہ بے شک یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے لیکن کشمیر اور ہزارہ میں بھی زبردست تباہی ہوئی ہے۔ اس کے بعد کی کہانی پاکستانی قوم، امت مسلمہ اور انسان دوست انسانوں کے عزم، حوصلے اور جستجو سے معمور ایک ولولہ انگیز کہانی ہے۔ متاثرہ علاقوں کے لوگوں کو اس المیے سے روشن مستقبل کی طرف لے جانے والے نشریاتی کارواں کا میں بھی ایک حدی خواں تھا۔

ہمارے کشمیر کو زلزلے کی تباہ کاریوں نے کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔ متاثرہ علاقوں سے لوگ پنجاب و سرحد کی طرف آنا شروع ہو گئے۔ ان ہی متاثرہ لوگوں میں کشمیر کے مشہور محقق، مورخ اور ماہر لسانیات پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی بھی تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب سے میرا تعارف ۱۹۷۰ء کے اوائل میں ہوا تھا جب وہ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''راج ترنگنی'' کی خوش نویسی کے سلسلے میں، ہمارے غریب خانے پر، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے محترم ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی (رہا) کے ہمراہ میرے والد محترم مولانا عبدالعزیز (مرحوم) سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔ زلزلے کے وقت تک ڈاکٹر صاحب سے ہمارے تعلقات کو پینتیس برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا۔ احترام کا رشتہ پہلے دن کی طرح مضبوط اور پرخلوص رہا۔

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو جب میں نے ریڈیو پاکستان کی تاریخ کے یادگار پروگرام ''صبح پاکستان'' کو ایک نئے انداز میں، بحیثیت پروڈیوسر پیش کرنے کا آغاز کیا تو اس میں ملک کے چاروں صوبوں، آزاد قبائل، شمالی علاقہ جات اور کشمیر کے تاریخی مقامات، رسوم و رواج اور روایات واقدار کے لیے بھی ایک گوشہ مختص کیا۔

زلزلہ۔ ۲۰۰۵ء کے بعد ڈاکٹر صاحب جب راولپنڈی تشریف لائے تو میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کشمیر کی مختلف جہتوں کو موضوع بنائیں اور ہمارے سامعین کی معلومات میں اضافہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب کا کتب خانہ مظفر آباد میں ہی رہ گیا تھا جبکہ ڈاکٹر صاحب راولپنڈی میں ''پناہ گزیں'' تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلب و دماغ کے گوشوں میں محفوظ احوال و آثار کو موئے قلم کی زینت بنایا اور کشمیر کے ماضی و حال کے بہت سے ابواب وا ہوئے اور رقم ہوتے چلے گئے۔ ایک نئی کہانی مرتب ہوگئی۔ کشمیر کی کہانی۔ پر مسرت اور حزن و یاس کی کہانی۔ شہنائی اور اکتارہ سے آراستہ خوشیوں بھری اور غم واندہ میں ڈوبی کہانی۔ ہوا کے دوش پر سامعین کی سماعتوں تک پہنچنے والی فضاؤں میں محفوظ یہی کہانی کتنے ہی عنوانات کے ساتھ آئندہ کے صفحات میں بکھری آپ کو پڑھنے کے لیے ملے گی۔

اس دوران میں ڈاکٹر صاحب کبھی راولپنڈی میں قیام پذیر ہوتے اور کبھی عازم مظفر آباد ہو جاتے۔ میرا ان کے ساتھ مسلسل رابطہ قائم رہا۔ ڈاکٹر صاحب مہینے میں ایک دو مرتبہ ہماری نشرگاہ میں تشریف لاتے اور چند تقاریر ریکارڈ کراتے۔ میں نے بحیثیت پروڈیوسر اور محترمہ نرگس رشید نے بطور میزبان اس سلسلے کا عنوان ''کشمیر کل اور آج'' تجویز کیا۔ سامعین نے پسند کیا۔ ملک بھر سے پسندیدگی کے خطوط آنے لگے اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

ریڈیو پاکستان کے قومی نشریاتی رابطے کے پروگرام ''صبح پاکستان'' کے دیگر وقیع سلسلوں میں یہ ایک شاندار سلسلہ تھا جس نے پروگرام کی مقبولیت میں اضافہ کیا اور یقیناً اس میں بنیادی کردار محترم ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب کا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ان ہی مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔ یقیناً حال و مستقبل کے علم دوست احباب کے لیے یہ ایک شاندار تحفہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب اب ماشاءاللہ ستر سے زائد برس کی عمر میں بھی جواں عزم ہیں۔ اہل وطن میں محبت کے پھول بانٹتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ہر انسان ایک دوسرے کا احترام و تکریم کرے۔ ان کی تحریروں کا یہی پیغام ہے۔

عبدالحفیظ بن عبدالعزیز

ڈپٹی کنٹرولر ریڈیو پاکستان، صدر دفتر، اسلام آباد

کشمیر کا حدود اربعہ

کشمیر ہمالیہ کے مغرب میں سطح سمندر سے کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ وادی کشمیر کی ساخت بیضوی شکل کی ہے اور چاروں طرف پہاڑی سلسلے سے گھری ہوئی ہے۔ وادی کا ہموار علاقہ ۸۴ میل لمبا ہے اور چوڑائی تقریباً ۲۵ میل ہے۔ رقبہ ۱۸ ہزار مربع میل ہے۔ کشمیر کے تین اہم پہاڑی سلسلے ہیں۔ پیر پنجال کا سلسلہ کوئی تقریباً ۲۰ میل چوڑا ہے جو کشمیر کی جنوبی اور جنوب مغربی سرحد ہے، یہ مشرق سے مغرب کی طرف ۵۰ میل تک ہے۔ کوہ ہمالیہ کا درمیانی سلسلہ وادی کشمیر کی شمال مشرقی سرحد ہے اور یہ پہاڑ دریائے جہلم اور دریائے سندھ کو الگ کرتا ہے۔ اس سلسلہ کی چوٹیاں بارہ ہزار فٹ سے چودہ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔

وادی کے شمال اور شمال مغرب میں پہاڑوں کا ایک بڑا سلسلہ درہ زوجیلا کے پاس سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی بلندی ۱۲ سو فٹ سے ۱۳ سو فٹ تک ہے۔ چوڑائی ۱۲ سے ۲۴ میل تک ہے۔ یہ پہاڑ شمالی سرحد کا کام دیتا ہے اور جنوب کی طرف سے جہلم کو دریائے نیلم سے جدا کرتا ہے۔

وادی کے جنوب مشرق میں وادی کشتواڑ ہے جو بالائی چناب کے علاقہ میں واقع ہے دریائے چناب کے زیریں علاقہ میں ضلع بھدرواہ ہے۔ قدیم عہد میں پیر پنجال کے جنوب میں چھوٹی چھوٹی متعدد ریاستیں تھیں جو حکومت کشمیر کی باج گزار تھیں۔ جنوب مغرب میں راجوری کا علاقہ ہے۔ راجوری کے شمال مغرب میں پونچھ کی مملکت تھی۔ وادی کشمیر کے شمال مغرب میں کرناہ کا علاقہ واقع ہے۔ شمال میں کشن گنگا کی وادی ہے جسے آج کل وادی نیلم کہا جاتا ہے۔ مشرق میں بلتستان اور لداخ ہے۔ وادی کشمیر دو حصوں پر مشتمل ہے میدانی علاقہ اور سطح مرتفع کا علاقہ۔ کھن بل سے بڑا میدان شروع ہوتا ہے۔ کشمیر گھنے جنگلوں، اونچے پہاڑوں اور گہری ندیوں کا علاقہ ہے۔ دریائے جہلم میں بے شمار ندیاں آ کر ملتی ہیں اور یہ دریا سرینگر کے مشرق میں ایک جھیل میں جسے ڈل کہتے ہیں آ کر ملتا ہے۔

جھیلوں میں ڈل اور ولر کی جھیل بہت مشہور ہیں، اقبال نے ولر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

جھیل ولر کی لمبائی بارہ میل اور چوڑائی پانچ میل ہے۔ اس میں میلوں تک پھیلا ہوا دلدل شامل ہے، جھیل ڈل کی لمبائی ۴ میل اور چوڑائی ۱۲ میل ہے۔ کشمیر کی ندیاں اور چشمے آبپاشی کے کام آتے تھے اور آتے ہیں۔

ان چشموں میں ملک ناگ، کوکرناگ کے چشمے مشہور ہیں۔ سب سے خوبصورت چشمہ اچھہ بل ہے۔ جموں کے راستے میں چشمہ ویری ناگ قابل ذکر ہے۔ کشمیر کی پہاڑی دیواروں کو ہم درہ کہہ سکتے ہیں۔ ان دروں کے ذریعے قدیم کشمیر بیرونی دنیا سے ملا ہوا تھا۔ یہ درے تجارت اور فوجی مہمات کے باعث بڑی اہمیت رکھتے تھے، پنجاب کی طرف جانے والے راستے جو پیر پنجال کو عبور کرتے ہیں بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ دوسرا درہ زوجیلا ہے جو کشمیر کو لداخ، تبت یارقند اور چین سے ملاتا ہے۔ درہ بانہال نو ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور یہ پیر پنجال کی آخری مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ یہ درہ ہمیشہ سے ہی بالائی چناب اور پنجاب کی مشرقی ریاستوں کے لیے آمدورفت کا آسان ترین راستہ رہا ہے۔ یہ راستہ سال بھر کھلا رہتا ہے۔ درہ پیر پنجال گیارہ ہزار چار سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس سے وسطی اور مغربی پنجاب کو سیدھی سڑکیں جاتی ہیں۔ کشمیر سے راجوری جانے والوں کے لیے یہ بیرونی راستہ تھا۔ مغل عہد میں کشمیر جانے کا آسان راستہ گجرات، بھمبر نوشہرہ اور کشمیر تھا۔ اکبر نے فتح کشمیر کے بعد یہاں شاہی سڑک بنانے کا حکم دیا۔ یہ سڑک لاہور کو کشمیر سے ملاتی تھی۔

درہ زوجیلا کی بلندی گیارہ ہزار تین سو فٹ ہے۔ یہ ایک عام شاہراہ رہا ہے یہ درہ کشمیر کو لداخ اور چین سے ملاتا ہے۔ لداخ سے بلتستان اور کوہ قراقرم سے آگے چینی ترکستان کو کئی راستے جاتے ہیں۔ مرزا حیدر دغلت نے اس درے سے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ درہ زوجیلا کے راستے ہی کشمیر نے چین اور ترکستان سے ثقافتی اور تجارتی رابطے قائم کیے تھے۔

ان دروں کے علاوہ کشمیر جانے والے وہ راستے جو پاکستان کو اس خطے سے ملاتے ہیں۔ بے شمار ہیں۔ سوجیت گڑھ کا راستہ جموں کو سیالکوٹ سے ملاتا ہے۔ گجرات بھمبر کی شاہراہ کشمیر کو

پنجاب سے ملاتی ہے۔قدیم زمانے میں ایک راستہ گوجر خان سے پونچھ جاتا تھا۔کوہالہ سے مظفرآباد کی شاہراہ اٹھارھویں صدی میں تعمیر ہوئی جو پاکستان کو سرینگر سے بغل گیر کرتی ہے۔گڑھی حبیب اللہ کا راستہ صوبہ سرحد کو کشمیر سے ملاتا ہے۔پکھلی سوات کا راستہ تاجکستان کو کشمیر سے ملاتا تھا۔مظفرآباد سرینگر کا راستہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ایران، ترکستان اور افغانستان کے علماء، صوفیاء اور سیاح اسی راستے کشمیر میں داخل ہوتے رہے ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال نے کشمیر جاتے ہوئے اور ۱۹۴۴ء میں قائداعظم نے کشمیر سے واپس آتے ہوئے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ آج امن بس نے مظفرآباد، سرینگر کی شاہراہ کو شاہراہ امن وسلامتی بنادیا ہے۔

طرز تعمیر

فائن آرٹس میں شاعری مصوری موسیقی اور تعمیر کو شامل کیا گیا ہے۔ جو قوم جتنی مہذب ہوگی وہ ان فنون لطیفہ میں اسی قدر ترقی یافتہ پائی جائے گی، خطہ کشمیر نے ہر فن میں شاہکار پیش کر کے دنیا کو محو حیرت کیا ہے۔ آج کی گفتگو میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ کشمیر میں فن تعمیر پر روشنی ڈالی جائے۔ کشمیر وادی میں پتھر اور عمارتی لکڑی کی فراوانی ہے چنانچہ قبل از اسلام کے ادوار میں یہاں مندر، سٹوپا پا وغیرہ پتھروں سے بنائے جاتے تھے لیکن اسلام کے آنے کے بعد مساجد، مقابر، قلعے اور عام مکانات دیودا کائل وغیرہ کی لکڑی سے بنائے جانے لگے۔ کشمیر کے مکانوں کی طرز تعمیر اسی خطے سے مخصوص ہے۔ ان مکانوں کی دیوار، فرش اور چھت لکڑی کے تختوں سے بنتی تھیں اور آج تک یہی طرز تعمیر وادی میں مروج ہے۔

کشمیر میں اسلامی اولین ریاست ۱۳۳۹ء میں قائم ہوئی جب شاہ میری خاندان کا ایک فرد سلطان شمس الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس خاندان کی حکومت ۱۳۹۳ء میں ختم ہوگئی۔ تقریباً پچاس سال کا یہ دور سلاطین کا دور کہلاتا ہے۔ سلاطین کشمیر عمارتیں بنوانے کے شوقین تھے لیکن آج ان عمارات کے نشان نہیں ملتے۔ اس عہد میں چوبی اور خشتی مکان بننے لگے تھے۔ سلطان زین العابدین کی والدہ کا مقبرہ آج بھی سرینگر میں موجود ہے اس کے پھاٹک کے اوپر اینٹ کی محراب اسلامی طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ نامور مورخ محب الحسن نے لکھا ہے کہ: بیرونی دیواروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر نیلے رنگ کی چمکیلی اینٹیں جڑی ہوئی ہیں۔ عمارت کے اوپر کے حصہ میں چار چھوٹے چھوٹے اور درمیان میں ایک بڑا گنبد ہے۔ سارے گنبد ایک طرز کے ہیں۔ درمیان کا گنبد ایک اونچے ستون پر ہے جس کی دیوار میں محراب بنے ہوئے ہیں۔ یہی طرز تعمیر کچھ ترمیم کے ساتھ کہسرام میں شیر شاہ کے مقبرے میں دکھائی دیتی ہے۔ سرینگر میں دوسری عمارت سید محمد مدنی کا مقبرہ ہے۔ سید مدنی سلطان سکندر کے عہد حکومت میں مدینہ سے کشمیر

تشریف لائے تھے۔اس مقبرہ کا سال تعمیر ۱۴۴۴ءلکھا ہوا تھا لیکن یہ مقبرہ اب قائم نہیں رہا۔اس کی رنگین اینٹ ایران سے لائی گئی تھی جو مغل ٹائل سے مختلف تھی۔اس کی کچھ اینٹیں سرینگر میوزیم میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔یہ رنگین اینٹیں مربع شکل کی تھیں اوران کے رنگ نہایت چمکیلے تھے۔ مقبرہ کی اس عمارت میں ایک جانور کی شبیہہ بھی بنائی گئی تھی۔لکڑی سے عمارات اس لیے بھی بنائی جاتی تھیں کہ یہ زلزلہ میں اینٹ اور پتھر کی عمارتوں کے مقابلے میں کم گرتی تھیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عبادت گاہوں کی عمارات جلدی جلدی بنائی جاتی تھیں اور سرعت تعمیر کا عمل لکڑی میں آسانی سے انجام پاتا تھا۔

کشمیر میں مقبرے اور مسجدیں ایک ہی طرز کے تھے اور سب کی شکل مربع تھی لیکن سرینگر کی جامع مسجد میں کئی چوکور عمارتیں ہیں۔درمیان میں ایک کشادہ صحن ہے جس کو ستون کی ایک قطار آپس میں ملاتی ہے۔دیواریں لکڑی کی ہوتیں اور اینٹوں کی بھی۔اہرام کی شکل کی چھت پر مینار ہوتا اور کلین دھات چسپاں ہوتی جو کھلی ہوئی چھتری کی طرح نظر آتی تھی۔

بقول محب الحسن: کشمیر میں مکانوں کی تعمیر میں جو طریقے استعمال ہوتے تھے مثلاً زینہ دار چھت گھاس کی مدد سے چھت کو ڈھانپنا خاص طور سے کشمیر کی اپج ہیں۔

وادی میں چوبی طرز تعمیر کی ایک مثال سرینگر میں شاہ ہمدان کی مسجد ہے جو خانقاہ معلیٰ کے نام سے مشہور ہے۔یہ مسجد دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر اینٹوں کی ایک غیر مسطح بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے۔اس کی لمبائی اور چوڑائی ۷۰ فٹ ہے۔عمارت دو منزل ہے۔اہرامی چھت تین تہوں میں بنی ہوئی ہے۔اوپر موذن کے لیے ایک شہ نشین ہے۔شہ نشین کے اوپر گنبد ہے اور اس پر کلس ہے،جس کی اونچائی زمین سے ۱۲۵ فٹ ہے،عمارت کے چاروں طرف چھت دار راستے اور برآمدے میں نچلی منزل میں ایک مستطیل نما بڑا کمرہ ہے۔لکڑی کی چھت اور دیواروں پر خوبصورت رنگوں کے نقش ونگار ہیں۔یہ خانقاہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ اور کشمیری طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ مسجد مدنی بھی لکڑی کی عمارت ہے جو ۱۴۱۴ء میں تعمیر ہوئی تھی،دیگر عمارات بھی کشمیر کے خاص اور خوبصورت فن تعمیر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

قدیم کشمیر کا معاشرتی نظام

چودھویں صدی کے آخر میں کشمیر میں اسلام پہنچا تو اس نے ایک بڑا فکری و عملی انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوؤں کے دور میں یہاں کا معاشرہ چار ذاتوں میں تقسیم تھا۔ اسلام کے فروغ سے مساوات پر مبنی سماج قائم ہوا۔ صوفیاء نے طبقات کو مٹا کر اتحاد پیدا کیا لیکن طبقاتی کشمکش ایک دوسری شکل میں جاری رہی، جاگیردار اور مراعات یافتہ طبقہ پھر بھی قائم رہا۔ فیوڈل سردار بڑی بڑی زمینوں کے مالک ہوتے اور حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہتے، یہ امراء اپنے ساتھ بہت سارے مصاحب رکھتے، وہ عام طور سے علم و ادب کے شیدائی ہوتے، مذہبی عمارتیں بنواتے لیکن ریشہ دوانیوں میں سرگرم بھی رہتے، یہ جاگیردارانہ نظام قیام پاکستان کے بعد ختم ہوا۔ مقامی اور باہر سے آنے والے خاندان آپس میں رقابت رکھتے تھے اور حصول اقتدار کے لیے ان کی رسہ کشی ہمیشہ رہتی، مذہبی طبقوں میں علماء، سادات اور صوفیاء کے تین طبقے نمایاں رہے۔

علماء میں موروثی رجحانات پائے جاتے تھے۔ کشمیر کے طلباء بخارا، ثمرقند، ہرات اور مکہ کا سفر کرتے اور مروجہ علوم کی تحصیل کے بعد وطن لوٹتے۔ ایک محقق کے بقول عہد وسطی کے کشمیر میں پیروں اور ان کے مریدوں کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ امیر کسیر سید اکبر علی ہمدانی نے راہ اعتدال نکالی، خانقاہوں کا نظام وسیع تھا۔

ایک بڑا طبقہ عوام کا تھا جن میں کسان، صنعتکار، ملاح، قصاب باغبان اور تاجر شامل تھے۔ یہ سبھی لوگ ہندومت کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے، سب سے نچلے درجہ پر چنڈال، ڈوم اور چمار سمجھے جاتے تھے۔

کشمیر میں عورتوں کی حیثیت وہی تھی جو دیگر ممالک میں عورت کی تھی۔ اونچے طبقہ کی خواتین پردہ کرتی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں کام کاج کرتی تھیں کھیتوں، باغوں اور دریاؤں میں اپنے شوہروں کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ امیر گھرانوں کی عورتیں تعلیم یافتہ ہوتیں مگر عام عورتوں میں

جہالت زیادہ تھی، شادی والدین کی پسند سے ہوتی، مردوں میں چار چار شادیاں کرنے کا رواج تھا۔ اکثر سلاطین کے دربار عیاشی سے پاک تھے۔

کشمیری لوگ جو لباس پہنتے وہ مقامی تھا، البتہ اونچے طبقہ کے لوگ ایران و ترکستان کا لباس زیب تن کرتے تھے۔ امیر لوگ ایرانی طرز کے پاجامہ اور پوری آستین کی قمیض پہنا کرتے تھے۔ قمیض کے اوپر چھوٹی سی صدری ہوتی تھی۔ اوپر کے کپڑے کو چغہ کہتے تھے۔ سر پر ٹوپی ہوتی جس پر کپڑا لگا ہوا ہوتا۔ علماء سیاہ عمامہ پہنتے اور تقریبات میں ریشمی لباس استعمال کرتے، بعض سلاطین اور امراء زیور بھی پہنتے تھے۔ نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے والا کشمیری ایک لمبا ڈھیلا ڈھالا اونی کرتا پہنتا جسے پھرن کہا جاتا تھا۔ یہ فارسی کے پیراہن سے بگڑا ہوا ایک لفظ ہے۔ پھرن گردن سے کمر تک کھلا اور ٹخنوں تک لٹکتا رہتا، تزک بابری کے مطابق کمر کے گرد پٹی کسی ہوتی تھی۔ جوتے عام طور پر شالی کی گھاس یعنی پرالی سے بنائے جاتے تھے، عورتیں بھی پھرن ہی پہنتی تھیں۔ عورتوں کے سر کے لباس کو کسابا کہتے تھے۔ کشمیر میں پھرن کا رواج اور دیہات میں کسابا کا رواج تیس سال قبل تک رہا۔ وادی کشمیر میں دھان کی فصل بہت ہوتی تھی اور آج بھی ہوتی ہے۔

اہل کشمیر کی بہترین غذا چاول رہا ہے جسے بھت کہتے ہیں۔ وادی کے لوگ دو وقت کے علاوہ صبح کا ناشتہ بھی چاول سے ہی کرتے تھے۔ ایرانی اثرات کے نتیجے میں ترش پلاؤ مقبول پکوان تھا، گوشت، مچھلی، انڈہ اور سبزی کشمیری کھانوں کا خاص جزو رہا ہے۔ مرغ، بھیڑ، بکری اور چڑیوں کے گوشت شوق سے کھائے جاتے تھے۔ تذکرہ ملا علی رینہ میں بیان ہوا ہے کہ گھوڑے کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا، گائے کا گوشت مسلمانوں کی حکومت کے بعد کھایا جانے لگا۔ سبزیاں سکھا کر محفوظ کر لی جاتی تھیں۔ مرغ کا گوشت بینگن میں ملا کر پکایا جاتا اور یہ مقبول غذا تھی۔ زعفران اور دوسرے مسالے کشمیری کھانوں کا خاص جزو تھا کشمیر میں پھل اس کثرت سے ہوتے تھے اور ہوتے ہیں کہ ہر شخص کو پھل توڑنے کی اجازت تھی۔ تاریخ رشیدی کا مولف مرزا حیدر دغلت لکھتا ہے کہ: کشمیر میں باغوں کے گرد دیوار نہیں ہوتی تھی۔ پھلوں میں ناشپاتی، آلوچہ، خوبانی، انگور، سیب اور شفتالو کثرت سے ہوتا تھا، کشمیری معطر اور لذیذ سیب دنیا بھر میں مشہور چلا آ رہا ہے۔ شہتوت کی فراوانی تھی اس لیے کشمیر میں ابریشم کثرت سے تیار ہوتا تھا۔ شراب نوشی کا

رواج نہ ہونے کے برابر تھا، راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ کشمیر میں پان دکن سے آتا تھا اور کثرت سے کھایا جاتا تھا، لیکن مسلم عہد میں پان کا ذکر نہیں ملتا، آج کے کشمیر اور اس کے پہاڑی علاقوں میں نئی روشنی کے نتیجے میں تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ معاشرت، معیشت، لباس، خوراک، طرز زیست اور ہر چیز میں مفید اور سودمند تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے:

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

کشمیریوں کی خوراک اور لباس

خوراک کا تہذیب وتمدن سے گہرا تعلق ہے۔ جتنی کوئی تہذیب قدیم ہوگی اس قوم کی غذاؤں میں اتنی رنگا رنگی ہوگی۔ کشمیر میں خوراک کے تنوع کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں مہمان کے سامنے غریب سے غریب آدمی کم سے کم دس پندرہ کھانے تو چن ہی دے گا۔ اس خطہ میں دیگر غذاؤں کے علاوہ گوشت، مرغ اور مچھلی خوراک کا جزو خاص ہے۔ گوشت سے درجنوں سالن بنائے جاسکتے ہیں۔ گشتابہ اور کوفتہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وادی میں لوگوں کی عام غذا بھت یعنی چاول ہے۔ آج سے تیس سال قبل وادی میں ناشتہ بھی بھت سے کیا جاتا تھا۔ بنگلہ دیش میں پکے ہوئے چاول کو غالباً بھت اسی لیے کہتے ہیں کہ جب کشمیر کے چند مہاجر ڈھاکہ میں جا کر رہنے سہنے لگے اور نواب کہلائے تو اس لفظ کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ گشتابہ کشمیر کا خاص پکوان ہے۔ یہ قیمہ کے گولے بنا کر دہی میں پکایا جاتا ہے قیمہ کے جو چھوٹے چھوٹے گولے پکائے جاتے ہیں انہیں رستہ کہتے ہیں اور ہر شادی بیاہ یا مہمانی میں شوق سے پیش کیا جاتا ہے اور ذوق وشوق سے کھایا جاتا ہے۔ آب گوش ایک اور لذیذ سالن ہے جو گوشت کو دودھ میں پکا کر تیار کیا جاتا ہے، یخنی اور پلاؤ مقداری طریقے سے ہی تیار ہوتا ہے۔ کشمیر کے تالابوں اور جھیلوں میں کنول کی کمی نہیں ہے۔ کشمیریوں نے اس کا مصرف یہ نکالا کہ کنول کی ڈنڈیوں کو سکھا کر رکھ لیتے اور ضرورت کے وقت یہ سبزی کے طور پر کام آتی ہیں۔ کشمیر کے جنگلوں میں گچھیاں یعنی مشروم خودرو ہوتی ہیں اور اس سے لذیذ سالن بنتا ہے۔

کھانا پکانے کے بعد طرح طرح کے میوے دسترخوان کی زینت بنتے ہیں اور پھر قہوے یا نون چائے کا دور چلتا ہے۔ کشمیر کی نون چائے خاص طریقے سے بنتی ہے اور کشمیر سے ہی مخصوص ہے۔

کشمیر کے میووں میں سیب، ناشپاتی، انگور، خوبانی، آلوچہ گلاس، انار، آڑو، توت بادام، کھیرا، خربوزہ، ھندوانہ وغیرہ شامل ہیں۔

اور اب کشمیری لباس کا مختصر ذکر

لباس کسی ملک کے جغرافیہ، موسمی حالات اور مذہبی و ثقافتی روایات کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ قدیم عہد میں کشمیریوں کا لباس الگ تھا۔ اسلام کے آنے کے بعد ملک کی بڑی آبادی نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کر لیا۔ یہاں ترک، ایرانی اور مغل تہذیب کے زیر اثر معاشرت میں تبدیلی آئی۔ کشمیری زبان کو فارسی اور عربی نے متاثر کیا چنانچہ کشمیریوں کا لباس بھی تبدیل ہوا۔ کشمیر میں فرن کا رواج ہوا جو فارسی لفظ پیراہن کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ فرن فرغل کی ایک شکل ہے جو گھٹنوں سے نیچے تک جاتا ہے اور آگے سے بند ہوتا ہے۔ فرن سردی سے بدن کو گرم رکھنے والا لباس ہے۔ فرن کے نیچے شلوار پہنی جاتی ہے۔ قمیص فرغل کے اندر پہنی جاتی ہے۔ کشمیر میں دستار کا رواج بہت تھا جو کلاہ کے بغیر باندھی جاتی تھی اور اس کا شملہ گدی کی طرف سے دستار کے اندر رکھ لیا جاتا تھا۔ پگڑی کے اندر ٹوپی استعمال ہوتی تھی۔ ایک گول ٹوپی ترنگہ کے نام سے مشہور ہے جسے عورتیں پہنتی ہیں۔ پشمینہ لیٹھے کی چادر شانوں پر رکھی جاتی ہے۔ پاؤں میں جوتا پہنا جاتا ہے۔ دیہات کے لوگ پرالی کے جوتے جسے کشمیری میں پلہور اور گوجری میں پول کہا جاتا ہے پہنتے تھے مگر اب اس کا رواج نہیں رہا۔ سفر پر نکلتے وقت پنڈلیوں پر ایک گرم اونی کپڑا باندھ لیا جاتا تھا۔ کشمیری میں اسے پاتو ہور اور گوجری میں جنگھوڑی کہتے ہیں۔ بجلی کے آنے سے پہلے کے ادوار میں کشمیری کانگڑی کا استعمال کرتے تھے۔ مٹی کے گول پیالہ پر باریک تیلیوں اور شاخوں سے خوبصورت ڈائزائنوں میں جو انگیٹھی بنائی جاتی تھی اسے کانگڑی کہتے ہیں۔ سردیوں میں کانگڑی ہر مرد اور عورت کے ساتھ ہوتی تھی۔ رات کو بستر میں رکھ لی جاتی لیکن کیا مجال کہ وہ کپڑوں یا بستر کو جلائے سوتے میں بھی اسے جلا کر رکھتے تھے۔ کانگڑی کا جو پیالہ ہے اس کے اندر راکھ ڈال کر اس میں انگارے یا چنار کے پتوں کو جلا کر راکھ رکھ لی جاتی تھی کانگڑی اس دور میں ہیٹر کا کام دیتی تھی۔ کانگڑی کی تعریف میں کسی شاعر نے کہا ہے اے کانگڑی اے کانگڑی۔ تو بہتر از حور و پری آج کانگڑی کا نام ہی رہ گیا ممکن ہے دیہات میں اس کا رواج ہو۔ کسابہ کپڑے کا بنا ہوا دوپٹہ ہے جو گول ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف بخاری کے بقول یہ مغل شہزادیوں کی یادگار ہے۔ ٹانچہ خاص کشمیری ٹوپی ہے جس پر کسابہ باندھا جاتا ہے۔ مغربی تہذیب کے آنے سے اب کشمیریوں کا قدیم لباس تبدیل ہو رہا ہے۔ ”کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔“

وادی کشمیر کے تہوار

دنیا کی ہر قوم میں تہوار منائے جاتے ہیں۔ تہوار کا تعلق مذہبی روایات، توہمات اور تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ وادی کشمیر کی تاریخ اور تمدن بہت قدیم ہے۔ ہندو مت اور بدھ مت کے بعد وادی کشمیر میں اسلام کی روشنی پہنچی، آج تک یہاں مذہبی ہم آہنگی اور رواداری پائی جاتی ہے۔ مسلم وغیر مسلم امن وسلامتی کے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کوئی بڑا ہندو مسلم مناقشہ نہیں ہوا۔ وادی میں مسلمانوں کی بے شمار رسمیں ہیں او ران کے تہوار اور بڑے دن بہت ہیں۔ بڑے مذہبی تہوار عیدین اور عید میلا د النبی صلی اللہ علیہ وسلم جوش وجزبے سے منائے جاتے ہیں۔ کشمیر اور دیگر اسلامی مما لک کے ان مذہبی تہواروں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں سوالاکھ اولیاء ہوئے ہیں۔ اگر اس خیال کو مبالغہ کہا جائے تو بھی اتنا مسلم ہے کہ وادی کے مختلف علاقوں میں لاتعداد اولیاء کے مزارات ہیں جن پر عرس ہوتے ہیں اور ان عرسوں میں ایک میلے کا سا سماں دکھائی دیتا ہے۔ کشمیر میں ایک تہوار سونتھ یعنی بسنت کا منایا جاتا ہے جب سرسوں کھلتی ہے تو اسے بہار کی آمد سمجھا جاتا ہے۔ یہ تہوار پنجاب میں بھی منایا جاتا ہے اور پتنگ بازی کی جاتی ہے۔ کشمیر میں بسنت کا تہوار مختلف طریقوں سے منانے کا رواج ہے لیکن وادی میں بسنت کا تعلق سرسوں سے نہیں ہے بلکہ یہ تہوار مارچ میں منایا جاتا ہے جب چیری اور بادام کے درخت شگوفوں کا لباس پہنتے ہیں۔ عام طور سے کشمیری اخروٹ، ناشپاتی، امرود اور کرم کا ساگ زمین سے نکالتے ہیں جو اس موسم کے لیے زمین میں دفنایا ہوتا ہے پھر یہ لوگ سونتھ کی خوشی میں یہ میوے اپنے بچوں اور ہمسایوں میں بانٹتے ہیں۔ سونتھ کے دن لوگ نیا لباس پہنتے اور سیر وتفریح کے لیے باغوں میں نکل جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اس دن عمدہ لباس پہنیں گے تو اور عمدہ کھانے کھائیں گے تو آنے والے سال کے دوران ان کو یہ نعمتیں وافر مقدار میں ملتی رہیں گی۔

اوراب کشمیری لباس کا مختصر ذکر

لباس کسی ملک کے جغرافیہ، موسمی حالات اور مذہبی وثقافتی روایات کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔قدیم عہد میں کشمیریوں کا لباس الگ تھا۔اسلام کے آنے کے بعد ملک کی بڑی آبادی نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کرلیا۔ یہاں ترک، ایرانی اور مغل تہذیب کے زیراثر معاشرت میں تبدیلی آئی۔کشمیری زبان کو فارسی اور عربی نے متاثر کیا چنانچہ کشمیریوں کا لباس بھی تبدیل ہوا۔کشمیر میں فرن کا رواج ہوا جو فارسی لفظ پیراہن کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔فرن فرغل کی ایک شکل ہے جو گھٹنوں سے نیچے تک جاتا ہے اور آگے سے بند ہوتا ہے۔فرن سردی سے بدن کو گرم رکھنے والا لباس ہے۔فرن کے نیچے شلوار پہنی جاتی ہے۔قمیص فرغل کے اندر پہنی جاتی ہے۔کشمیر میں دستار کا رواج بہت تھا جو کلاہ کے بغیر باندھی جاتی تھی اور اس کا شملہ گدی کی طرف سے دستار کے اندر رکھ لیا جاتا تھا۔پگڑی کے اندر ٹوپی استعمال ہوتی تھی۔ایک گول ٹوپی ترنگہ کے نام سے مشہور ہے جسے عورتیں پہنتی ہیں۔ پشمینہ لٹھے کی چادر شانوں پر رکھی جاتی ہے۔ پاؤں میں جوتا پہنا جاتا ہے۔دیہات کے لوگ پرالی کے جوتے جسے کشمیری میں پلھور اور گوجری میں پول کہا جاتا ہے پہنتے تھے مگر اب اس کا رواج نہیں رہا۔سفر پر نکلتے وقت پنڈلیوں پر ایک گرم اونی کپڑا باندھ لیا جاتا تھا۔کشمیری میں اسے پاتوہور اور گوجری میں جنگھوڑی کہتے ہیں۔بجلی کے آنے سے پہلے کے ادوار میں کشمیری کانگڑی کا استعمال کرتے تھے۔مٹی کے گول پیالہ پر باریک تیلیوں اور شاخوں سے خوبصورت ڈائزائنوں میں جو انگیٹھی بنائی جاتی تھی اسے کانگڑی کہتے ہیں۔سردیوں میں کانگڑی ہر مرد اور عورت کے ساتھ ہوتی تھی۔رات کو بستر میں رکھ لی جاتی لیکن کیا مجال کہ وہ کپڑوں یا بستر کو جلائے سوتے میں بھی اسے جلا کر رکھتے تھے۔کانگڑی کا جو پیالہ ہے اس کے اندر راکھ ڈال کر اس میں انگارے یا چنار کے پتوں کو جلا کر راکھ رکھ لی جاتی تھی کانگڑی اس دور میں ہیٹر کا کام دیتی تھی۔کانگڑی کی تعریف میں کسی شاعر نے کہا ہے اے کانگڑی اے کانگڑی۔تو بہتر از حورو پری آج کانگڑی کا نام ہی رہ گیا ممکن ہے دیہات میں اس کا رواج ہو۔کسابہ کپڑے کا بنا ہوا دوپٹہ ہے جو گول ہوتا ہے۔ڈاکٹر یوسف بخاری کے بقول یہ مغل شہزادیوں کی یادگار ہے۔ٹانچہ خاص کشمیری ٹوپی ہے جس پر کسابہ باندھا جاتا ہے۔مغربی تہذیب کے آنے سے اب کشمیریوں کا قدیم لباس تبدیل ہورہا ہے۔"کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔"

وادی کشمیر کے تہوار

دنیا کی ہر قوم میں تہوار منائے جاتے ہیں۔ تہوار کا تعلق مذہبی روایات، توہمات اور تاریخی واقعات سے ہوتا ہے۔ وادی کشمیر کی تاریخ اور تمدن بہت قدیم ہے۔ ہندومت اور بدھ مت کے بعد وادی کشمیر میں اسلام کی روشنی پہنچی، آج تک یہاں مذہبی ہم آہنگی اور رواداری پائی جاتی ہے۔ مسلم وغیر مسلم امن وسلامتی کے ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کوئی بڑا ہندو مسلم مناقشہ نہیں ہوا۔ وادی میں مسلمانوں کی بے شمار رسمیں ہیں او ران کے تہوار اور بڑے دن بہت ہیں۔ بڑے مذہبی تہوار عیدین اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم جوش وجزبے سے منائے جاتے ہیں۔ کشمیر اور دیگر اسلامی ممالک کے ان مذہبی تہواروں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں سوالاکھ اولیاء ہوئے ہیں۔ اگر اس خیال کو مبالغہ کہا جائے تو بھی اتنا مسلم ہے کہ وادی کے مختلف علاقوں میں لاتعداد اولیاء کے مزارات ہیں جن پر عرس ہوتے ہیں اور ان عرسوں میں ایک میلے کا سا سماں دکھائی دیتا ہے۔ کشمیر میں ایک تہوار سونتھ یعنی بسنت کا منایا جاتا ہے جب سرسوں کھلتی ہے تو اسے بہار کی آمد سمجھا جاتا ہے۔ یہ تہوار پنجاب میں بھی منایا جاتا ہے اور پتنگ بازی کی جاتی ہے۔ کشمیر میں بسنت کا تہوار مختلف طریقوں سے منانے کا رواج ہے لیکن وادی میں بسنت کا تعلق سرسوں سے نہیں ہے بلکہ یہ تہوار مارچ میں منایا جاتا ہے جب چیری اور بادام کے درخت شگوفوں کا لباس پہنتے ہیں۔ عام طور سے کشمیری اخروٹ، ناشپاتی، امرود اور کرم کا ساگ زمین سے نکالتے ہیں جو اس موسم کے لیے زمین میں دفنایا ہوتا ہے پھر یہ لوگ سونتھ کی خوشی میں یہ میوے اپنے بچوں اور ہمسایوں میں بانٹتے ہیں۔ سونتھ کے دن لوگ نیا لباس پہنتے اور سیر وتفریح کے لیے باغوں میں نکل جاتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر اس دن عمدہ لباس پہنیں گے تو اور عمدہ کھانے کھائیں گے تو آنے والے سال کے دوران ان کو یہ نعمتیں وافر مقدار میں ملتی رہیں گی۔

نوروز ایران کا قدیم قومی تہوار ہے۔ اسلام کی آمد کی بدولت یہ تہوار کشمیر میں متعارف کروایا گیا جو آج بھی منایا جاتا ہے نوروز بیساکھ کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ یہ اعتدال کا موسم ہوتا ہے جب آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے اور نباتات بہار کا تحفہ پاتے ہیں، نوروز کو بابرکت دن سمجھا جاتا ہے۔ ایران میں ہفت سین کا اہتمام ہوتا ہے لیکن کشمیر میں اس کی صورت یہ ہے کہ رات کو ایک تھالی میں گندم بھرتے ہیں اور تھوڑے سے چاول بھی رکھتے ہیں۔ تھالی میں گلاب کی کونپل اور بادام رکھتے ہیں پکی ہوئی نمکین روٹی ائینہ قلم دان اور سال نو کی تقویم رکھتے ہیں۔

راجہ بکرماجیت نے جو تقویم مرتب کر کے رائج کی اسے سنہ بکرمی کہا جاتا ہے۔ یہ تقویم آج بھی پنجاب اور کشمیر میں رائج ہے۔ خاص طور سے دیہات کے لوگ اسی سے حساب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ گاؤں کی ان پڑھ بڑی بوڑھیاں آپ کو بکرمی سال اور اس کے ساتھ مہینہ اور دن بھی بتا دیں گی۔ بیساکھ فصل بہار کا پہلا مہینہ ہے، سکھوں میں بیساکھ منانے کا رواج بہت ہے لیکن ریاست جموں و کشمیر کے دیہاتوں میں مسلمان بھی اس دن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ پہلی بیساکھ کو کشمیر کے دیہات میں ایک پرندہ بولتا ہے جسے ککو کہتے ہیں چنانچہ ککو بہار کی علامت بن گیا ہے۔ پہاڑی اور گوجری زبان میں ککو اور بیساکھ سے متعلق درجنوں گیت ہیں جو دیہات میں گائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ یہی تمنا کرتے ہیں کاش سارا سال ہی بیساکھ کا موسم رہے اور خزاں کبھی نہ آئے لیکن گردش لیل و نہار اور بہار و خزاں کا اپنا ہی انتظام اور نظام ہے جب بیساکھ کا مہینہ گزرنے لگتا ہے تو عوام میں ایک عجیب سی اداسی اور جدائی کا احساس پیدا ہوتا ہے تب گاؤں کی دوشیزاؤں کے لب پر گیت کا یہ بول رقص کرنے لگتا ہے اور فضا میں نور بکھیر دیتا ہے:

بساکھ پہلو مڑیئے

اے بیساکھ جلدی جلدی لوٹ آنا

کشمیر کے موسم اور شادی بیاہ کی رسمیں

وادی کشمیر اونچے اونچے پہاڑوں، گھنے گھنے جنگلوں اور رواں دواں ندیوں کا خطہ ہے۔ برف باری کے موسم میں وادی شدید سردی کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ پہلے زمانوں میں بعض اوقات جھیل ڈل کا پانی جم جاتا تھا اور لوگ اس پر چلا کرتے تھے، سردیوں کا موسم اثرات کی وجہ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

چلہ کلاں

سردیوں کا ابتدائی چالیس دنوں کا عرصہ چلہ کلاں کہلاتا ہے۔ چلہ خورد یہ عرصہ تیس دن کا ہوتا ہے۔ چلہ بچہ بیس دن کا موسم ہے جب موسم میں سردی کی شدت کم ہوجاتی ہے چلہ بچہ کے بعد سونتھ کا موسم شروع ہوتا ہے۔ اس وقت میدانی علاقوں میں برف پگھلنے لگتی ہے، بہار کا موسم آتا ہے جب درختوں میں ہریالی شروع ہوتی ہے نرگس کے پھل کھلتے ہیں ڈاکٹر یوسف بخاری لکھتے ہیں کہ: وہراتھ وہ موسم ہے جب چیت اور بیساکھ میں بارشیں ہوتی ہیں اور برف پگھل جاتی ہے۔ موسم بہار کے بعد موسم گرما شروع ہوتا ہے۔ بہار اور برسات کے بعد خزاں کا موسم آ جاتا ہے فصلیں کاٹی جاتی ہیں سردیوں کے لیے لوگ ضروری اشیاء مثلاً بالن غلہ اور سبزیوں کا ذخیرہ کرتے ہیں۔ موسم سرما میں مرد و زن گھریلو دستکاریوں میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ قالین بافی گبہ سازی وغیرہ کا کام عموماً اس موسم میں انجام پاتا ہے۔ گھروں میں عورتیں پشمینہ کات کر اقتصادی ترقی میں حصہ لیتی ہیں۔ موسم کے حوالے سے کشمیر میں کئی رسمیں مروج ہیں ''نوشین کھالن'' ایک رسم ہے جب پہلی رات کو برف پڑتی ہے تو صبح سویرے جو آدمی اسے دیکھے وہ کسی عزیز یا رشتہ دار کے ہاتھ میں برف تھما دیتا ہے اور کہتا ہے نوشین مبارک۔ برف باری مبارک ہو مبارک باد قبول کرنے والا مٹھائی یا پکوان پیش کرتا ہے اسے کشمیری میں نوشین کھالن کہتے ہیں۔ برف پڑنے کے بعد چاندنی ہر چیز کو روشن کر دیتی ہے اور برف جم جاتی ہے تو اس رسم کو کتر لگن کہا جاتا ہے، اس وقت لوگ کھیلتے ہیں۔

شینہ جنگ کی رسم میں دو ٹیمیں برف کے گولے ایک دوسرے پر پھینکتی ہیں۔ برف جم جاتی ہے تو لوگ بید کے ڈنڈوں پر رسی باندھ کر پہاڑوں پر برف میں سکیٹنگ کرنے کے لیے نکل جاتے ہیں اس رسم کو شکار تراون کہا جاتا ہے۔ موسم خزاں کے شروع ہوتے ہی سفید کیکر کی شاخیں اتاری جاتی ہیں جو بعد میں جلانے کے کام آتی ہیں جب فصلیں کھلیان میں جمع کی جاتی ہیں تو اس رسم کو کھلس کہتے ہیں۔ ترکاریاں اور دالیں سکھا کر رکھ لی جاتی ہیں اور اس عمل کو شین پھون کا نام دیا گیا ہے۔ گاؤں والے کسی خاص دن جنگل سے لکڑیاں لا کر اس آدمی کو دیتے تھے جو نیاز یا ختم دے رہا ہوتا۔ ون گھسن ایک اور رواج تھا جب گاؤں کی عورتیں لکڑیاں لانے کے لیے جنگل چلی جاتی تھیں آج ان رسموں کا رواج نہیں رہا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے،

کشمیر میں شادی بیاہ کیسے کیا جاتا ہے! اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

پہلی کارروائی منزم یور کہلاتی ہے۔ آدمی لڑکے والوں کی طرف سے پیغام لے کر لڑکی والوں کے گھر جاتا ہے اگر والدین راضی ہو جائیں تو بات آگے چلتی ہے۔ دوسری رسم بانس تراون یہ ہے کہ لڑکے والا اور وکیل اور کچھ معززین لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں وہاں پہلے چائے قہوہ سے پذیرائی کی جاتی ہے، پھر لڑکے والا اپنی پیالی میں کچھ نقدی ڈال دیتا ہے اگر یہ رقم لڑکی والا قبول کر لے تو یہی منگنی ہے۔ پھر لڑکی والا کچھ دنوں کے بعد یہی رسم دہراتا ہے اور یوں شادی کی بات پکی ہو جاتی ہے۔

بکرل رسم یہ ہے کہ مقررہ تاریخ پر لڑکے والے لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں کچھ زیور اور کپڑے دلہن کے لیے لے جاتے ہیں اور نکاح خوانی ہو جاتی ہے پھر شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں شادی کی تاریخ سے قبل لڑکی کی خوراک میں تبدیلی کی جاتی ہے، نرم غذائیں دی جاتی ہیں، لڑکی گھر کی چار دیواری میں ہی رہتی ہے پھر لڑکی کے بال کھولے جاتے ہیں اور بالوں کو دھو کر تیل اور عطر لگاتی ہیں۔ حنابندی کی رسم مائنزرات کہلاتی ہے ادھر دولہا کو سجایا جاتا ہے۔ لڑکے والے عام طور پر دوپہر کے بعد بارات لے جاتے ہیں۔ اس موقع پر پرتکلف دعوت دی جاتی ہے۔ ڈولی کو چار آدمی اٹھاتے ہیں ڈولی عموماً کرایہ دار مزدور اٹھاتے ہیں۔ اردو میں ان کو کہار اور کشمیری میں ان کو کہر کہتے ہیں۔ غالب کو شکایت تھی کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے۔ ان تمام رسوم کا نام کھاندر شادی ہے دودھ موج یعنی رضاعی ماں لڑکی کے ساتھ رہتی ہے جو اسے آداب سکھاتی ہے۔ رشتہ دار امدادی اشیاء دیتے ہیں دلہن اور دولہا کو اقرباء اور احباب کچھ رقم بطور معاونت دیتے ہیں جسے سلوم کہتے ہیں بعد میں ولیمہ ہوتا ہے۔ سات دن کے بعد لڑکی میکے آتی ہے پھر داماد کی دعوت کی جاتی ہے۔

کشمیر میں تجارت

تجارت، کاروبار اور اشیاء کا لین دین ہر ملک کی اقتصادی ضرورت ہے۔ وادی کشمیر اونچے اونچے پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ ضروریات زندگی کی ساری چیزیں اس وادی کو میسر نہیں رہیں۔ لہٰذا یہ قوم مجبوراً نئی نئی منڈیاں تلاش کرتی رہی جن تک رسائی حاصل کرے۔ عہد وسطی کی کشمیری قوم کا کاروبار بنگال، لہاسہ، بیجنگ، ایران اور وسط ایشیا تک پھیلا ہوا تھا۔ کشمیر کے تاجر درآمد و برآمد کے ذریعے اپنی معیشت کو ترقی دیتے تھے۔ درآمدی اشیاء میں نمک خاص طور سے قابل ذکر ہے کیونکہ کشمیر میں نمک نہیں پایا جاتا۔ نمک پوٹھوہار سے درآمد کیا جاتا تھا۔ غلہ کا کاروبار حکومت بھی کرتی اور نجی کمپنیاں بھی۔ شال، ریشمی کپڑے، اونی کپڑے اور دستکاری کا دوسرا سامان کشمیر میں اعلیٰ پیمانے کا ہوتا تھا۔ چاول کا ذخیرہ حکومت رکھتی تھی اور اس طرح عوام کو چاول سارا سال مہیا ہو جاتا تھا۔

عہد وسطی کے کشمیر میں بازار کم تھے، اکثر لوگ کاروبار گھروں میں کرتے تھے۔ مرزا حیدر دغلت تاریخ رشیدی میں رقمطراز ہے کہ: بازار میں صرف بزاز اور پرچون فرش بیٹھتے تھے پنساری، دوافروش اور نان بائی گھر پر ہی کاروبار کرتے۔ مغل دور حکومت میں بازار کھلے اور تجارت عام ہوئی۔ مال ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے اور لے جانے کے لیے سواری کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم جس زمانے کی بات کر رہے ہیں اس زمانے میں یہ وسائل میسر نہ تھے۔ عام آدمی پیدل چلا کرتا تھا۔ صاحب ثروت لوگ گھوڑوں، پالکیوں اور ڈولیوں میں بیٹھ کر سفر کیا کرتے۔ کشمیر کے اندر جھیل ڈل کے کنارے لوگ کشتیوں کے ذریعے آمد و رفت جاری رکھتے اور سامان تجارت بھی کشتیوں کے ذریعے ہی منتقل کیا جاتا تھا۔ دیہات میں سامان قلیوں اور خچروں کے ذریعے لے جایا جاتا۔ دریاؤں پر لکڑی کے پل ہوتے۔ ندیوں پر رسی کے پل بھی عام تھے۔ شرف الدین یزدی نے ظفر نامہ میں دریائے جہلم پر کئی کشتیوں کے پلوں کا ذکر کیا ہے۔ کشمیریوں

نے بیرون ملک تجارت کا جال بچھا رکھا تھا، پٹنہ، بنارس، کٹھمنڈو خراساں اور ترکستان ان کے اہم تجارتی مراکز تھے۔ پروفیسر محب الحسن کے مطابق کشمیر اور پنجاب کی تجارت پیر پنجال کے دروں سے ہوتی تھی، بلتستان اور مشرقی ترکستان کی پنجاب سے تجارت بالعموم کشمیر ہی کے راستے ہوتی تھی۔ کشمیر اور لیہہ کے درمیان تجارت درہ زوجیلا سے ہوتی تھی۔ سرینگر سے لہیہ تک سامان تجارت قلیوں کے ذریعے ایک ماہ میں پہنچتا تھا۔ کشمیر کے جو تاجر یارقند جاتے ان کا ایک پڑاؤ لہیہ تھا قراقرم کو عبور کر کے تجارتی قافلے یارقند پہنچتے تھے۔ یارقند سے کچھ قافلے کاشغر جاتے اور وہاں سے سمرقند اور بخارا پہنچتے اور بعض قافلے کاشغر سے چین جاتے۔

لداخ کا راستہ بند ہو جاتا تو تاجر گلگت کے راستے ماورانہر کے علاقوں تک جاتے، ان کو پامیر اور دریائے جیحون کو عبور کرنا ہوتا تھا۔ کشمیر اور ایران میں آمدورفت پنجاب سے ہوتی تھی۔ جرنل آف پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جلدرائے کی رو سے لاہور سے ایران ہر سال بیس ہزار اونٹ مال تجارت لے کر جاتے تھے۔ کھٹمنڈو میں کشمیر کے تجار کی ایجنسیاں قائم تھیں۔

کشمیر کی اشیائے درآمد میں شال سرفہرست تھی۔ شال کا اون لداخ اور یارقند سے بھی آتا تھا۔ شال کا اون کشمیر کے لیے بنیادی مواد تھا کیونکہ اسی پر شال بافوں کی کامیابی کا دارومدار تھا۔ شال کے اون کے علاوہ کشمیر میں تبت سے سونا اور مشک درآمد ہوتا تھا۔ لداخ سے اونی کپڑوں کی درآمد بھی ہوتی تھی۔ پنجاب سے نمک کے علاہ کشیدہ کاری کے کپڑے اور لاکھ آتی تھی بلتستان اور گلگت سے ریشم کے انڈے لائے جاتے تھے، ختن سے کاغذ، مٹی کے برتن پیتل اور تانبے کے برتن کشمیر میں لائے جاتے تھے۔ عقیق فیروزہ وغیرہ بدخستان بخارا اور یارقند سے درآمد کیا جاتا تھا۔ عراق اور ترکستان سے گھوڑے آتے تھے۔

کشمیر درجنوں چیزیں بیرون ملک برآمد کرتا تھا۔ شال نہ صرف پاکستان، وسط ایشیا، تبت اور چین کو بلکہ ابوالفضل کی تحقیق کے مطابق دنیا کے ہر ملک کو بھیجا جاتا تھا۔ سامان برآمد میں مشک، ریشم، اونی کپڑا، زعفران، کشمش، اخروٹ، کاغذ وغیرہ قابل ذکر ہے۔ کشمیری تاجر اسی راستے سے پنجاب، لداخ، بلتستان، مشرقی ترکستان سے تجارت کرتا تھا۔ سرینگر ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ پروفیسر محب الحسن کے بقول یہاں ترکی، تبتی، لداخی، بلتی، پنجابی اور کشمیری تاجر کاروبار کرتے تھے۔ اس طرح کشمیر میں ایک کثیر الالوان ثقافت متعارف ہوئی جو اس خطے کا طرۂ امتیاز ہے۔

کشمیر کی شال بافی

اہل کشمیر اپنی ذہانت اور چرب دستی کی بدولت صنعت وحرفت میں مشہور رہے ہیں۔ قالین بافی، شال بافی، کندہ کاری، کشیدہ کاری، پیپر ماشی اور سینکڑوں صنعتوں میں کشمیریوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ قالین بافی کے ساتھ ساتھ شال بافی کشمیر کی قدیم ترین صنعت ہے۔ سلطنت روما کے عہد میں شال بافی نے صنعت کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور کشمیر کی شال رومی دربار سے فخر سے استعمال ہوتی تھی۔ امیر کبیر حضرت شاہ ہمدان نے اس صنعت کو خاص توجہ سے فروغ دیا۔ ۱۵۴۱ء میں مرزا حیدر دغلت کا خانساماں نغز بیگ جو خوقند کا رہنے والا تھا۔ کشمیر آیا وہ ایک زبردست آرٹسٹ تھا اس نے شال بافی کو مزید فروغ دیا۔

شال بافی میں ڈیزائن کے کئی اقسام ہیں اور متعدد فنی باریکیاں ہیں جن پر گفتگو کرنے کے لیے فرصت کی ضرورت ہے مختصر یہ ہے کہ یہ تین طریقوں سے بنائی جاتی ہے۔

مغل بادشاہ شال کشمیر کے دلدادہ تھے، اکبر مشرقی ترکستان کے شہر ایذ بحان سے بافندے کشمیر لایا جنہوں نے شال بافی میں تبدیلیاں کیں، شال کے رنگ اور لمبائی میں تبدیلی کی گئی اسی عہد میں چنبہ کا ڈیزائن تیار ہوا۔ اس عہد میں شال حکومت برآمد کرتی تھی اور دہلی وآگرہ اس کی منڈیاں تھیں۔ افغانوں نے غیر ملکیوں کو کشمیر سے نکال باہر کیا اور شال بافی پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صنعت پھل پھول نہ سکی۔ نصرت نثار لکھتی ہیں کہ ۱۷۹۴ء میں ایک اندھا آدمی بغداد سے کشمیر آیا جس کا نام یحیٰ تھا۔ عبداللہ خان کا عہد تھا، مذکور نے سید یحیٰ کو ایک شال بطور تحفہ پیش کی۔ یحیٰ نے واپس جا کر یہ شال مصر کے حکمران خدیو کو ہدیہ کر دی۔ بعد میں خدیو نے یہی شال فرانس کے بادشاہ نپولین بونا پارٹ کو پیش کر دی۔ اس طرح کشمیر کی شال مغربی دنیا میں متعارف ہوئی چنانچہ بعد کے زمانے میں فرانسیسی تاجروں نے سرینگر اور امرتسر میں شال کی خرید وفروخت کے لیے ایجنسیاں قائم کیں۔ اس سے پہلے شال کشمیر، ایران، افغانستان،

ترکستان اور روس کے بازاروں میں بکتی تھی۔ یہ اہل مغرب کی آنکھ کا تارا بن گئی۔ یہ سکھوں کے عہد حکومت میں شال بافی کی صنعت زندہ تو رہی مگر اس میں قابل ذکر ترقی نظر نہیں آتی۔ البتہ ڈوگرہ عہد غلامی کا اپنی تمام ترنحوستوں کے باوجود شال بافی کے لیے نیک شگون ثابت ہوا۔ کشمیر پر ڈوگرہ گلاب سنگھ نے ۱۸۴۶ء میں بدنام زمانہ معاہدہ امرتسر کے ذریعے قبضہ کیا۔ گلاب سنگھ فن وہنر اور صنعت وحرفت کا دلدادہ تھا، گلاب سنگھ کے دور میں کشمیر میں شال بافی عروج پر پہنچی۔ مشہور ہے کہ اس کے عہد حکومت میں وادی میں ستائیس ہزار بافندے گیارہ ہزار کھڈیوں پر شال بافی کا کام کرتے تھے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں اس صنعت کو ترقی کرنے کا موقع ملا اور کشمیر میں بہترین خوبصورت اور ملائم ترین شال تیار ہونے لگی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کشمیری صناع جو شال بنتے اس کی نقل نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسی دور میں شال سٹائل تبدیل ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب فرانس وغیرہ کے تاجروں نے کشمیر میں اپنی مزید ایجنسیاں قائم کیں اور وہ طرح طرح کے ڈیزائنوں کی بہترین شال خرید کر یورپ کی منڈیوں میں پہنچانے لگے۔ اس سے جہاں کشمیر میں خوشحالی آئی وہاں کشمیر اور اہل کشمیر کی صناعی اور چرب دستی کا اعتراف دنیائے مغرب میں ہونے لگا۔ جو کشمیری صدیوں تک زمانے کی آنکھ سے چھپے رہے وہ اپنے فن، فن سے لگن، اختراع اور جدت کے سبب دنیا میں پہچانے جانے لگے اور اقبال کے اس شعر کا مصداق بنے:

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آب ولر کے تمام یکدانہ

کشمیر میں جڑی بوٹیوں سے علاج

کشمیر اونچے پہاڑوں اور گھنے جنگلوں کا علاقہ ہے۔ ان پہاڑوں، جنگلوں اور ندی نالوں کے کنارے رنگا رنگ جڑی بوٹیوں کی فراوانی ہے۔ دنیا بھر میں قدیم زمانوں میں خودرو جڑی بوٹیوں سے انسانوں اور جانوروں کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ یونان غالباً دنیا کا پہلا ملک ہے جس کے علمائے نباتات نے جڑی بوٹیوں پر اپنی تحقیقات کا آغاز کیا اور ہر بوٹی کے خواص دریافت کر کے علاج معالجے کا عمل شروع کیا۔ اس کے بعد طبی تحقیقات روم اور پھر برصغیر میں شروع ہوئی اور یہاں کے طبیبوں نے اس فن کو آگے بڑھایا پھر ہوتے ہوتے یہ فن شریف مغرب میں پہنچا۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی عرض کیا ریاست جموں و کشمیر میں جڑی بوٹیوں کی کوئی کمی نہیں اور چونکہ آج سے سو دو سو سال پہلے طب جدید نے ترقی نہیں کی تھی۔ ناگزیر ضرورت کے تحت ریاست کے باشندوں نے سالہا سال کے مشاہدے، مطالعے اور تجربے کی بدولت بے شمار جڑی بوٹیوں کے خواص دریافت کر لیے تھے اور وہ مختلف امراض و عوارض کے علاج کے لیے ان جڑی بوٹیوں کو استعمال میں لاتے تھے۔ اس طریقہ کے علاج کو ہم عوامی طب کہہ سکتے ہیں۔ اس عہد میں دیہات کے عمر رسیدہ اشخاص اور بڑی بوڑھیاں جانتی تھیں کہ کسی خاص بیماری کا علاج کس جڑی بوٹی سے ہو سکتا ہے اور وہ کون سی جگہ سے ملتی ہے۔ یہ علاج جہاں سستا تھا وہاں اکثر موثر و مفید ہوتا تھا کہ بخار، سردرد، شکم درد، زخم چوٹ وغیرہ کے لیے یقینی علاج تھا۔

اب ہم جڑی بوٹیوں کے متداول نام، خواص اور نشانات وغیرہ سے صرف نظر کرتے ہوئے چندان جڑی بوٹیوں کے طبی فائدے بتاتے ہیں جو کشمیر، آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد کے پہاڑوں اور دیہات میں پائی جاتی ہیں۔

اسپند کے بیج پیٹ کے کیڑے ہلاک کرنے کے لیے مفید ہیں اور نوبتی بخار کے لیے بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ کرانک ملیریا کے لیے موثر علاج سمجھا جاتا رہا ہے۔ اکاش بیل (نیل

دھاری) کو کوٹ کر بخار والے مریض کو پلایا جاتا ہے۔ آک کی جڑ کی چھال امراض جلد اور آنتوں کے کرم کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس کے پھول ہاضم مقوی معدہ اور دمہ کے لیے مفید ہیں۔ اس کا دودھ زہر ہے۔ روئی زخموں کو مندمل کرتی ہے۔ اجوائن خراسانی دودھ میں گرم کر کے دی جاتی ہے۔ یہ مسکن اور دافع تشنج ہے، بے خوابی کے لیے مفید ہے بنفشہ کی تاثیر سردتر ہے۔ صفراوی طبیعتوں میں ملین کے طور پر استعمال ہوتا ہے پیشاب آور ہے، بنفشہ کا شربت کھانسی اور گلے کی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ دریک کا رس پلانے سے پیٹ کے کیڑے مرجاتے ہیں۔ ورم کو ٹھیک کرتا ہے۔ دریک کے پھولوں پتوں اور چھال کے کئی فوائد ہیں، جنگلی اخروٹ جسے پہاڑی میں بن کھوڑی کہتے ہیں۔ اس کے پھل کا مغز نکال کر خشک کر لیتے ہیں اور پھر پیس کر درد گردہ کے لیے ایک ماشہ کی مقدار پانی کے ساتھ کھلایا جاتا ہے یہ پتھری کا اخراج بھی کرتا ہے۔ جھاؤ کے پھول یابس ہوتے ہیں اس کا جوشاندہ زخموں کو دھونے کے کام آتا ہے اور جوشاندہ پیچش کے لیے مفید ہے۔ پاپڑا مقوی معدہ اور دافع تپ ہے۔ بچوں کو کوٹ کر پلایا جاتا ہے، خوب کلاں تے لاتی ہے، دوران خون کو تیز کرتی ہے، بخار کو روکتی ہے، پیشانی پر لیپ کرنے سے دردسر جاتا رہتا ہے۔ دیودار کا برادہ کھرل کر کے کھانے سے بخار و نفخ کو دور کرتا اور استسقا کو مفید ہے۔ لکڑی کو کشید کر کے تیل نکالا جاتا ہے جو بکریوں کی خارش کے لیے مفید ہے نیز جزام کے زخموں پر لگایا جاتا ہے کئی اور بیماریوں میں مفید ہے۔ گل دھاوا یعنی تہاویے کے پھول خونی اسہال اور جریان خون میں بے حد مفید ہیں، اس کا سفوف زخموں کو اچھا کر دیتا ہے۔ دھتورہ مقوی معدہ ہے بیج دمہ کے لیے چلم میں رکھ کر پلائے جاتے ہیں۔ کالی کھانسی کے لیے مفید ہے۔ کالی زیری دانت کے درد اور کرم شکم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ چوٹیال گھس کر زخموں پر لگایا جاتا ہے۔ کمیلا کا سرخ سفوف پیٹ کے کیڑے مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

کپاس کے بیج سوزش مثانہ، تپ دق کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے اس کی تازہ ڈوڈیاں پیچش کا بہترین علاج ہے۔ گوگل دھوپ کے لوشن سے پرانے ناسوروں کو دھونی دیتے ہیں جو جراثیم کش ہے، بلغم کو خارج کرتا ہے، حلق کے امراض میں استعمال ہوتا ہے۔ لیموں کا رس مفرح اور قابض ہے قاطع صفرا اور زہروں کا تریاق ہے۔ تھیم کا رس امراض گوش اور زخموں کے لیے فائدہ مند ہے۔ مکو جسے کاچ ماچ کہتے ہیں اس کا پھل مقوی اور پیشاب آور اور دل کے امراض میں مفید ہے۔ بخارا اسہال آشوب چشم کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ بچوں کے اسہال کے لیے بے حد مفید ہے۔

سلاجیت دمہ اور مثانہ کی بیماریاں، اعصابی امراض اور شوگر کے لیے استعمال ہوتی ہے۔
جلدی امراض میں جراثیم کی ہلاکت اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر استعمال کرتے ہیں، یہ زہر کا تریاق بھی ہے۔ کستوری مرگیبھر یا بچوں کے تشنج کے لیے مفید ہے۔ مقوی دماغ ہے۔ طب میں کستوری کو مقوی دل اور محرک تسلیم کیا گیا ہے۔ پرانی کھانسی اور عام ناطاقتی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے فوائد بہت ہیں۔ زعفران مقوی معدہ ممسک اور دافع تشنج ہے۔ کھانوں میں بھی اس کا استعمال عام ہے۔ پطریس بچوں کے پیٹ درد کے لیے مجرب ہے، کٹھ کی تھوڑی مقدار کئی بیماریوں میں مفید ہے مگر زیادہ مقدار زہر ہے۔ کوار گندل پھوڑوں اور سوجن کو دور کرنے میں مجرب ہے۔ اسے کوٹ کر پھوڑ پر رکھا جاتا ہے۔ کھائی جائے تو قبض کشا اور مقوی معدہ ہے۔ جگر اور تلی کے بڑھنے کے عارضہ نیز یرقان کے لیے فائدہ بخش ہے۔ مشک بالا کی جڑ مقوی اور دافع تشنج ہے۔ نیم کی چھال مصفی خون مقوی اور دافع بخار بتائی گئی ہے۔ اس کا استعمال قے اور متلی کو روکتا ہے۔ پتے جلدی امراض کے لیے اکسیر اعظم ہیں۔ نیم کا پھل داخلی طور پر مسہل اور خارجی طور پر مسکن درد ہے۔ ہاتھوں، کمر درد اور جوڑوں کے درد کے لیے حلوے میں دی جاتی ہے۔

نیرا کی دھونی بچوں کے سوکھے پن میں مفید ہے۔ دیمک اور کیڑے مکوڑے مارنے کے لیے استعمال عام ہے۔ ماس لون دردوں کے لیے مفید ہے۔ اس کی جڑوں کے سفوف سے بہترین چائے بنتی ہے۔ رتن جوت ایک جڑی بوٹی ہے اس کا حلوہ بنا کر جوڑوں کے درد والے کو کھلایا جاتا ہے۔ ٹماٹر عام سبزی ہے اس کا رس چہرے کو دلکش بناتا ہے مولی کے بیج پیس کر اور دہی میں ملا کر لگانے سے کیل مہاسے دور ہو جاتے ہیں۔ لہسن کا پانی لگانے سے ناخن مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لیموں کے چھلکے سکھا کر پیس لیں اور نمک ملا کر دانتوں پر لگائیں تو دانت چمکدار ہو جائیں گے خربوزے کے چھلکے سکھا کر رکھ لیتے ہیں اس کا سفوف ڈالنے سے گوشت جلدی پک جاتا ہے۔ ابلبا کا ساگ اور پانی بادی کے دردوں کے لیے آزمودہ نسخہ ہے۔

چھکن ایک خوشبودار بوٹی ہے چھکن کے پتوں اور پھولوں کا حلوہ ہر قسم کے جسمانی درد کے لیے اکسیر سمجھا جاتا ہے۔ کاکوا ایک بوٹی ہے جو چشموں کے اردگرد پائی جاتی ہے اس کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اسے کوٹ کر پانی نکالا جاتا ہے۔ گرمی نکالنے اور بخار توڑنے کے لیے اس کا استعمال ریاست جموں و کشمیر اور ہزارہ کے دیہی علاقوں میں بہت عام ہے۔

گینتھی کا تیل خارش کی جگہ پر لگایا جاتا ہے سندھور کمزور بچوں کو دیا جاتا ہے۔ رتی بوٹی کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گرمی کے لیے کوٹ کر پی جاتی ہے، خوبانی کا بیج سردی دور کرتا ہے۔ پیو مار ملیریا کے بخار کو توڑتا ہے۔ بڈھی میوہ جوڑوں کے درد دور کرتا ہے یہ قہوہ میں دیا جاتا ہے۔ جوگی پھل معدہ کا درد دور کرتا ہے ہلا سفید اگر آدمی گر جائے تو اس کے اندرونی درد کے لیے دیا جاتا ہے۔ ہلدی رگڑ کر چوٹ یا زخم پر لگائی جاتی ہے۔ بھنگ کے پتوں کا لیپ ورم والی جگہ پر لگایا جاتا ہے عام طور سے پتوں کو تیل میں تل لیا جاتا ہے۔ چٹی جڑی برص کے مریض کو کھلائی جاتی ہے۔ گنھار ایک سبزی ہے اس کے بیج کا حلوہ جوڑوں کے درد اور دانت کے درد کے لیے مجرب ہے۔ موچ آ جائے تو اس کے بیجوں کا لیپ اس جگہ پر لگایا جاتا ہے۔ چھاؤ کا پانی دانت درد کے لیے پلایا جاتا تھا۔ چورادانت درد کے لیے مفید ہے۔ بھیکڑ کا رس نکال کر گھٹنوں کے درد کو دور کرنے کے لیے پلایا جاتا ہے۔ خربوزے کے بیج گردوں کی صفائی کرتے ہیں۔ مرچ سبز اور سرخ درد گردہ کا علاج ہے۔ ابلے ہوئے پانی میں شہد ملا کر پینے سے گردے کی سوزش دور ہو جاتی ہے۔ مولی گردے کی پتھری کے مریض کو فائدہ دیتی ہے۔ لوبیا کے پتوں کا ساگ پتھری کے لیے مفید ہے، چولائی کا مسلسل استعمال پتھری کو توڑ کر نکال دیتا ہے...... سرسوں کا بیج پیشاب آور ہے۔ یاد رہے کہ طب کی کتابوں میں تقریباً تین سو پچاس جڑی بوٹیوں کے نام اور خواص ملتے ہیں۔ ہم نے اس گفتگو میں فقط ان جڑی بوٹیوں کا ذکر کیا ہے جو کشمیر میں ملتی ہیں اور ان کے نام وہی بتائے ہیں جو عوام میں جانے پہچانے ہیں۔ ان کے استعمال کا طریقہ اس لیے نہیں بتایا گیا کہ دیہات کی عورتیں ان کے طریق استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ بہت ساری جڑی بوٹیاں ایسی ہیں جن کا ذکر اس گفتگو میں نہیں آ سکا۔ جڑی بوٹیوں کے استعمال کے علاوہ ریاست جموں و کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں ریچھ کی چربی طاقت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ شیر کا سوکھا ہوا گوشت بچوں کے سوکھے کی بیماری میں بطور دھونی کام میں لایا جاتا تھا، بارہ سنگھا کا سینگ رگڑ کر نمونیا کے مریض کو چٹایا جاتا تھا۔ دیہات میں جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج سستا اور آسان تھا اور آج بھی ہے مگر اب طبی تحقیقات کی بدولت ان جڑی بوٹیوں سے مشینوں کے ذریعے ادویہ تیار کر لی گئی ہیں اور ان کا استعمال ہو رہا ہے لیکن دور دراز کے دیہات میں ان جڑی بوٹیوں کو آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

کشمیر کی مصنوعات اور زراعت

اقبال نے اہل کشمیر کو بجا طور پر چرب دست وتر دماغ کہا ہے۔ کشمیر کی ہزاروں برسوں کی تاریخ اقبال کے اس قول کی تائید کرتی ہے۔ کشمیری قوم صنعت وحرفت میں ہمیشہ بے مثال رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اس خطہ کی مشہور صنعتوں میں شال بافی کے علاوہ ریشم کے کپڑوں، کاغذ اور شیشہ سازی کی ہر دور میں حوصلہ افزائی کی گئی۔ بڈھ شاہ کے دور میں ان صنعتوں کو فروغ ملا۔ کشمیر میں اونی کپڑا بڑا نفیس تیار ہوتا تھا جو پائیداری اور گرمی کے لیے مشہور تھا۔ ایران کے حماسہ سرا شاعر ابوالقاسم فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں لکھا ہے کہ ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی افواج کا لباس کشمیر کے اونی کپڑے سے تیار کیا جاتا تھا۔ وادی کشمیر میں شہتوت کے باغوں کی کثرت رہی ہے چنانچہ یہاں شہتوت کے پتوں پر ریشم کے انڈے پالے جاتے جن سے ریشم تیار کیا جاتا۔ کشمیر میں جو کاغذ بنایا جاتا وہ ریشم کی طرح نرم اور چمکدار ہوتا تھا۔ برصغیر میں اس کاغذ کی بڑی مانگ تھی کیونکہ یہ مصوری اور تحریر میں استعمال ہوتا تھا۔ جارج فارسٹر نے ۱۷۸۳ء میں لکھا ہے کہ: سرزمین مشرق میں سب سے اچھا کاغذ کشمیر میں ہی بنتا ہے۔ عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں تحریر کرتا ہے کہ کشمیر میں بنے ہوئے کاغذ کی تحریر کو دھو کر اس کو دوبارہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔

ہفت اقلیم کی شہادت یہ ہے کہ اکبر کے عہد میں وادی کشمیر میں دو ہزار کارخانوں میں شال بنتا تھا۔

زراعت

راج ترنگنی کا مترجم ایم۔ اے سٹائن لکھتا ہے کہ کشمیر میں مسلمانوں کی سلطنت کی تاسیس سے دو سو سال پہلے ہی وہاں زراعت کو زوال آ چکا تھا۔ اکثر دیہات کے لوگ نقل مکانی کر چکے تھے لیکن شاہ میری خاندان برسر اقتدار آیا تو اس نے زراعت کو از سر نو ترقی دی۔ گاؤں آباد ہوئے۔ زائد محصول کم کر دیئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزروعہ میں بڑھ گئی اور ملک غلہ میں خود کفیل ہو گیا۔ کشمیر میں بہار کے موسم میں گندم، جو، مٹر اور سرسوں وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔

فصل خریف میں چاول، مونگ اور باجرہ کی کاشت کی جاتی ہے مگر وادی کشمیر کی اصل پیداوار
چاول ہے۔ مارتنڈ کے علاقے میں گنا بھی لگایا جاتا تھا۔ کشمیر کا زعفران دنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔
تزک جہانگیری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں زعفران بڑی مقدار میں پیدا ہوتا
تھا۔ زعفران پام پور کے مقام پر ہوتا ہے۔ تزک جہانگیری میں آیا ہے کہ زعفران کی کل پیداوار
چار سو سے پانسو ہندوستانی من کے درمیان ہوتی تھی اور ایک سیر زعفران کی قیمت دس روپے
تھی۔ کشمیر میں باغات لگانے کا رواج شاہمیری خاندان سے شروع ہوا۔ سلاطین شاہمیری کے
علاوہ کشمیر کے تجار اور امراء بھی پھول اگاتے اور باغات لگاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کشمیر کے ہر مکان
کے صحن میں ایک باغ ضرور ہوتا تھا۔ سرکاری اور نجی اداروں کے علاوہ کشمیر میں درخت کاری کو جس
گروہ نے رواج دیا وہ صوفیاء کا رشی فرقہ تھا۔ سلسلہ ریشیہ کے صوفیاء گاؤں گاؤں گھومتے اور پھلدار
اور سایہ دار درخت لگاتے اس طرح ساری وادی ہی ایک باغ بن گئی تھی۔ فرزند کشمیر علامہ اقبال کا یہ
مصرعہ ہمارے دعویٰ پر گواہ صادق ہے سبزہ جہاں جہاں لالہ چمن چمن نگر۔ ان باغات سے خوبانی،
شفتالو، آلوچہ، انگور اور بادام کا پھل حاصل کیا جاتا تھا۔ پھلوں کے علاوہ پھولوں میں نرگس، کنول،
گلاب، چنبیلی سوسن، سنبل بنفشہ کے پھول قابل ذکر ہیں۔ وادی کی آب وہوا ٹھنڈی ہے اس لیے
یہاں نارنگی اور لیموں نہیں ہوتا ہے۔ کشمیر کا اخروٹ مشہور ترین پھل ہے جو خشک فروٹ کا بادشاہ
سمجھا جاتا ہے۔ یہ صورتحال وادی تک محدود نہیں ہے بلکہ ریاست کے تمام حصوں جموں، کشتواڑ،
ڈوڈہ، بھدروہ ریاسی راجوری پونچھ گلگت بلتستان اور لداخ میں سینکڑوں طرح کے پھل اور پھول پید
اہوتے ہیں۔ ان تمام علاقوں کی مٹی اور آب وہوا ہی ایسی ہے کہ کوئی علاقہ خشک یا بنجر نہیں ہے۔ یہ
سارے پہاڑی خطے غلے اور میووں میں خود کفیل رہے ہیں۔ کشمیر کا عظیم سلطان بڈشاہ جو شاعر بھی تھا
اور قطبی تخلص کرتا تھا کشمیر کی تعریف میں کہتا ہے:

ہزاران گل بود فصل خزاں در باغ کشمیرم
چہ می نازی تو ای کابل ہمیں یک ارغواں داری
میرے باغ کشمیر کے موسم خزاں میں ہزاروں طرح کے پھول کھلتے ہیں
اے کابل تو ایک ارغواں کے پھول پر کیا اتراتا ہے

کشمیر میں اسلامی تمدن کا فروغ

وادی کشمیر ایک نگینہ زمرد ہے تو اس کے اطراف میں واقع علاقہ ہائے کشتواڑ جموں، راجوری، پونچھ، مظفر آباد، گلگت بلتستان اور لداخ اس نگینے کا حلقہ زریں۔

کشمیر وادی اگر پھول ہے تو اطراف کے پہاڑی علاقے اس پھول کی پنکھڑیاں۔

کشمیر کی تمدنی سرگزشت کا تاریخی ریکارڈ ہمیں ۲۶۶۶ ق م سے ملتا ہے۔ کشمیر کی طویل تاریخ کے دوران یہاں کی علمی وادبی زبان سنسکرت رہی جو بھوج پتر پر لکھی جاتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب مسلمانوں نے سندھ کو فتح کیا تو اسلامی لشکر میں عرب وعجم کے مسلمان شامل تھے۔ اسی زمانے سے فارسی زبان اس خطے میں متعارف ہونے لگی۔ ۱۳۲۵ء میں کشمیر کا بودھ راجہ رنچن مسلمان ہوا اور اس نے صدرالدین کا لقب اختیار کیا۔ اس تاریخی واقعہ کے چند ہی سال بعد ۱۳۳۹ء میں شاہ میری خاندان کی حکومت قائم ہوئی، شاہ میری دور حکومت میں ایران وترکستان سے آنے والے سینکڑوں علماء وصوفیاء کی بدولت کشمیر میں ایک فکری انقلاب برپا ہوا۔ مسلمان نیا تمدن، نیا نظام، معاشرت اور نئی صنعتیں ہمراہ لائے۔ ہجری تقویم کا رواج ہوا۔ کشمیر اور اس کے اطراف پر ۱۳۲۵ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک چار مسلمان خاندان۔ شاہ میری، چک، مغل اور افغانی حکومت کرتے رہے۔ اس پانصد سالہ عہد حکومت میں یہاں اسلامی تہذیب وتمدن علم وادب، فکر وفلسفہ اور فن وہنر کو فروغ ملا۔

اسلامی علوم کی تدریس ہونے لگی۔ لائبریریاں قائم ہوئیں۔ کتابیں تالیف کی جانے لگیں شیخ یعقوب صرفی، ملا محسن فانی، ملا محمد سعید، ملا کمال جیسے باکمال علماء پیدا ہوئے...... صوفیاء کے سلسلے سہروردی، قادری، نقشبندی، چشتی نوربخشی متعارف ہوئے۔ شیخ نورالدین نورانی نے سلسلہ ریشیہ کا آغاز کیا، خانقاہیں تعمیر ہوئیں فارسی میں تاریخی کتب لکھی گئیں، ان مورخین میں حیدر ملک چاڈورہ، سید مہدی کشمیری نرائن کول عاجز خواجہ اعظم دیدہ مری، دیوان کرپارام، پیر غلام حسین

کھوئی ہامی اور حاجی محمد مسکین قابل ذکر ہیں جن فارسی گو شعراء نے نام پیدا کیا ان میں صرفی، محسن فانی، مظہری غنی، داراب جویا، اسلم سالم اور حمید اللہ شاہ آبادی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

فارسی وعربی نے کشمیری، پہاڑی، گوجری، ڈوگری، لداخی، بلتی اور شینا زبانوں پر اثر ڈالا اوران زبانوں کوغنی کیا۔

نئے قلعوں، باغوں، نہروں، پلوں، مسجدوں اور خانقاہوں میں اسلامی فن تعمیر کا حسن نظر آنے لگا۔ اس دور میں فارسی مثنویوں کو سامنے رکھ کر کشمیری زبان میں خمسے کہے گئے۔ عرب وفارس کی داستانوں شیریں فرہاد، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، وامق وعذرا کو کشمیری کا جامہ پہنایا گیا۔ مجسمہ سازی کی جگہ خطاطی، مصورانہ خطاطی اور نقاشی کو رواج دیا گیا۔ کشمیر کے جن خوشنویسوں نے برصغیر میں شہرت پائی ان میں میر حسن کشمیری، محمد حسین زریں قلم، حسین کشمیری، محمد مراد زریں قلم، محمد علی کشمیری، ملا باقر کشمیری بہاالدین خوشنویس، حیدر کشمیری، ہدایت اللہ زریں قلم، امام دیری اور آج کے دور میں رشید بٹ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ کشمیر کا باشندہ شاعری خوش الحان پرندوں سے رقاصی بل کھاتی ہوئی ندیوں سے اور موسیقی نغمہ ریز جھرنوں سے بچپن میں ہی سیکھ لیتا ہے۔ ان فنون کا فروغ ہر عہد میں رہا۔ جن ایرانی راگنیوں کو کشمیری مطربوں اور سازندوں نے اپنایا ان میں مشہور یہ ہیں: راست، راست کشمیری، چراغ، عراق، نوا، شاہنواز، نوروز، نیریز، زنگولہ، چہار گاہ، کلیان، کھماج، بھاگ، جھجوٹی پہاڑی، ٹوڑی، آساوری تلنگ، سوھنی، سورتھ، رہاوی، بلاول۔ حسینی، کانگڑہ وغیرہ۔

صنعتوں میں قالین بافی، زین سازی، نمدہ سازی، سنگ تراشی، شیشہ گری، اسلحہ سازی، قلمدان سازی، شال بافی، گبہ سازی، طلاکاری کو فروغ ہوا اور وادی کشمیر صنعتوں میں شہرۂ آفاق ہوگئی۔ کشمیری صناعوں کے بنائے ہوئے قلم دان کابل، ایران، فرانس اور انگلستان کو برآمد کیے جاتے تھے، مختصر یہ کہ خطہ کشمیر صدیوں سے اسلامی تہذیب وتمدن اور فن وہنر کا مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اسلامی تمدن اس سرزمین کی پہچان ہے اور اس تمدن کی عمارت توحید، مساوات، رواداری، اعتدال پسندی، عدل اور احترام بشر پر استوار ہے۔ ایک ایسی عمارت جسے ہمیشہ قائم و استوار رہنا ہے۔

سلاطین کشمیر کا نظام سلطنت

کشمیر میں شاہ میری اور چک حکمرانوں کا دور سلاطین کا دور حکومت کہلاتا ہے۔ شاہ میری خاندان کے کوئی ۱۹ سلاطین نے اپنا اقتدار قائم رکھا۔ یہ دور ۱۳۳۹ء سے شروع ہوا اور ۱۵۶۱ء پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ پہلا بادشاہ شمس الدین تھا اور آخری حبیب شاہ...... اس خاندان کے تین حکمران نظم ونسق، فتوحات اور بہتر اقتصادی نظام کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ شہاب الدین سکندر اور زین العابدین، زین العابدین بڈشاہ کا دور حکومت ۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۲ء پر محیط ہے۔ بڈشاہ سیاسی و سماجی اصلاحات رواداری انہ پالیسی اور علم پروری کے حوالے سے اکبراعظم کا پیشرو سمجھا جاتا ہے۔ ۱۵۶۱ء میں چک خاندان کا ایک فرد غازی شاہ برسر اقتدار آیا اور ۱۵۸۶ء میں حسنین شاہ پر اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۳۳۹ء سے لے کر ۱۵۸۶ء تک تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اس طویل عہد میں سلطنت کا نظام جس طرح ظہور پذیر ہوا اس گفتگو میں ہم اس کی چند جھلکیاں دکھانا چاہتے ہیں۔

قدیم کشمیر کا سلطان مطلق العنان ہوتا اور قانون سازی کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، وہ خود سپاہ سالار ہوتا اور اپیل کی سب سے بڑی عدالت بھی وہی ہوتا، سلطان کے ساتھ وزراء اور مشیروں کی ایک مجلس مشاورت ہوا کرتی تھی۔ مجلس کے اراکین جاگیردار خاندانوں کے بااثر افراد ہوتے۔ اگر سلطان طاقتور نہ ہوتا تو امراء امور کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتے تھے۔

شریعت کے امور میں سلطان شیخ الاسلام سے مشورہ لیا کرتا، کبھی کبھی مشکل مسائل میں فقہا سے مشورت کی جاتی۔ کشمیر کے حکمران سلطان کا لقب اختیار کرتے تھے لیکن شاہ اور بادشاہ بھی کہلاتے تھے۔ سلطان کا نام جمعہ کے خطبہ میں لیا جاتا تھا اور حیدر ملک چاڈورہ کے بقول سلطان کا یہ خصوصی امتیاز تھا کہ مساجد میں خطبہ جمعہ میں اس کا نام لیا جائے اور اس کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگی جائیں۔ سلطان اپنے نام کا سکہ جاری کرتا تھا، بعض اوقات کسی ولی کے نام کا سکہ

بھی ڈھالا جاتا، اس ضمن میں شیخ نورالدین ولی کے نام کا سکہ قابل ذکر ہے۔تخت حکومت پر بیٹھنے کا حق فقط سلطان کو تھا، تاج بھی وہی پہنتا تھا اگر کسی سلطان کو اقتدار سے دستبردار ہونا پڑتا تو وہ تخت وتاج اپنے جانشین کے حوالے کر دیتا تھا۔ سلطان سرکاری افسروں اور باج گزاروں کو خلعت عطا کرنے کا امتیاز بھی رکھتا تھا۔ سرکار کا خزانہ اور شاہی اصطبل ہوتا۔ پرچم شاہی اقتدار اور جلال سلطنت کی نشانی تھا۔

سلطان کے بعد اہم سیاسی منصب وزیر کا ہوتا۔ وزیر فوجی نظم ونسق میں مداخلت کرنے کا حق نہ رکھتا اگرچہ حکومت کا سب سے بڑا عہدے دار سمجھا جاتا تھا۔اس کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ جاگیرداروں میں وزارت کا منصب حاصل کرنے کے لیے سازشیں ہوا کرتی تھیں۔ عام طور سے بااعتماد، صاحب فہم وفراست اور دلیر آدمی کو وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز کیا جاتا تھا۔

وزیر کے بعد بڑا منصب دیوان کل کا تھا۔شعبہ مالیات کا اختیار دیوان کل کے پاس ہوتا۔

مذہبی امور کی وزارت کا نگران شیخ الاسلام کو بنایا جاتا تھا۔شیخ الاسلام ملک کے علماء کا نمائندہ اور شرعی مسائل کا مرجع ہوتا۔بادشاہ کی رسم تاج پوشی شیخ الاسلام کے ہاتھوں انجام پاتی۔ وہ سلطان کا مشیر اور اوقاف کا نگران بھی ہوتا تھا۔

نظام عدل میں قاضی اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ چکوں کے عہد میں قاضی کا رعب اور اختیارات بے حد امور بڑھ گئے تھے۔ قاضی نماز کی امامت کرتا اور مذہبی امور کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ قاضی کے ماتحت میر عدل کا منصب تھا۔ قاضی کے سامنے پیش ہونے سے قبل فریقین میر عدل سے رجوع کرتے۔

بغاوت کے مجرموں کو سزائے موت دی جاتی یا ان کے اعضاء کاٹے جاتے۔ میر بخشی ایک اور منصب تھا۔ میر بخشی کا کام محکمہ فوج کی نگرانی کرنا ہوتا تھا۔وہ سپاہیوں کا اندراج کرتا اور انہیں تنخواہیں ادا کرتا، نئے سپاہیوں کی بھرتی بھی میر بخشی کے فرائض میں داخل تھا۔

'طبقات اکبری کی شہادت کے مطابق امیر دار ایک اہم افسر تھا جو سلطان کا معتمد علیہ ہوتا وہ ہمیشہ سلطان کی معیت وہمراہی میں رہتا۔ سلطان کے سامنے عرضیاں اسی کے ذریعے پیش ہوتی تھیں۔ وہ سرکاری تقاریب کا انتظام کرتا تھا۔ ملک کشمیر کے دروں کا نگہبان ہوتا تھا جسے دوار پتی بھی کہا جاتا تھا، نائیک کا تقرر خود سلطان کرتا اس کے پاس فوجی دستہ بھی ہوتا تھا اور یہ درآمد و برآمد

کے مال پر محصول بھی وصول کرتا تھا۔خفیہ پولیس کا انتظام بھی ان سلاطین کے عہد میں رہا۔خزانچی کو توال اور محتسب کے عہدے بھی موجود تھے۔کوتوال کا کام شہر میں امن و امان قائم کرنا تھا وہ چوروں کو سزائے موت بھی دے سکتا تھا۔سرکاری دستاویزات محافظ خانہ میں رکھی جاتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے شعبے اور بھی تھے۔ہر شعبہ کے معتمد کو دبیر کہا جاتا تھا۔دربار شاہی میں منجم کا عہدہ بھی تھا...... پروفیسر محب الحسن کی تحقیق کے مطابق سلاطین کشمیر کے دربار میں موسیقی کا شعبہ بھی ہوتا تھا۔صوبائی نظام بھی کام کرتا رہا، جاگیردارانہ نظام بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔شکر ہے یہ منحوس نظام جاگیرداری قیام پاکستان کے بعد ختم کر دیا گیا۔

کشمیر کے حکمران خاندان

برصغیر کی مستند تاریخ راج ترنگنی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خطہ کشمیر پر صدیوں تک غیر مسلم حکمران حکومت کرتے رہے۔ گونند اول نے ۲۴۵۰ ق م میں یہاں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے کے ۵۲ حکمرانوں کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ اس کے بعد بدھ راجہ اشوک نے ۳۰۰ ق م میں اپنا سکہ چلایا اس عہد کا فرماں روا کنشک مشہور ہوا۔ بدھ حکمرانوں کا اقتدار نو سو سال تک رہا۔

پھر ھن قوم کا سردار مہر گل قابض ہوا۔ اس کا عہد ۵۲۸ ہے یہ بڑا ظالم تھا اور اس کے دور حکومت میں منگول کشمیر پر حملہ آور ہوئے لیکن بری طرح شکست کھائی۔ راجہ پرورسین درندہ صفت تھا جس نے ۵۸۰ میں اقتدار پر قبضہ کیا۔ اس نے پرور پور کے نام سے شہر آباد کیا جو بعد میں سرینگر کے نام سے مشہور ہوا۔

راجہ للتادتیہ ۷۵۳ تک برسر اقتدار رہا۔ اس نے حدود سلطنت کو وسعت دی۔ اونتی ورمن کے بعد تقریباً چار سو سال تک طوائف الملوکی رہی چنانچہ ۱۳۱۹ میں زولچو نے جو تاتاری تھا کشمیر پر حملہ کر دیا۔ زولچو قتل و غارت کے بعد واپس چلا گیا تو رنچن گدی پر بیٹھ گیا۔ رنچن ترکستان کے صوفی شرف الدین بلبل شاہ کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر مسلمان ہو گیا۔ ۱۳۲۳ء میں رنچن نے جو صدرالدین کے نام سے مشہور ہے وفات پائی کچھ برسوں کے بعد سوات کے ایک شخص شاہ میر نے قبضہ کر لیا اور شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ یہ کشمیر میں شاہ میری خاندان کی حکومت کا بانی ہے۔ اس خاندان نے ۲۱۶ برس تک حکومت کی۔ اس عہد میں فن و ہنر اور شعر و ادب نے ترقی کی اور کشمیر کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئیں۔ سلطان شہاب الدین نے اطراف کے علاقے فتح کیے اس خاندان کا حکمران بڈھ شاہ بڑا بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے پچاس سالہ دور میں تعمیر و ترقی میں نام پیدا کیا۔ اس عہد میں ایران سے حضرت سید علی ہمدانی اپنے رفقاء کے ساتھ کشمیر آئے۔ چک خاندان دوسرا مسلم حکمران ہو گزرا ہے وزیر غازی چک نے ۱۵۵۵ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ چکوں کے آٹھ حکمران ۱۵۸۶ء تک حکومت کرتے رہے۔ شیخ حمزہ مخدوم یعقوب صرفی اور طاہر رفیق پر مشتمل تین آدمیوں کا وفد اکبر بادشاہ کے پاس گیا اور کشمیر کو سلطنت مغلیہ میں شامل کرنے کی اپیل کی۔ اکبر کی

افواج نے دو حملے کیے مگر کشمیریوں نے ان کو شکست دے دی...... بہر حال ۱۵۸۶ء میں کشمیر کو فتح کر لیا گیا۔ (پروفیسر محی الدین قاضی کی تحقیق کے مطابق مغلوں نے کشمیر پر حملے کیے) مغلوں نے کشمیر کو خوبصورت بنایا، باغات لگوائے اور قلعے تعمیر کروائے۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد نظم ونسق درہم برہم ہو گیا تو میر مقیم نامی سردار کابل پہنچا اور احمد شاہ ابدالی کو کشمیر پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔ چونکہ ۱۷۵۲ء میں کشمیر کو افغانستان کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ افغان گورنر کشمیر پر ۶۶ سال تک حکومت کرتے رہے۔ وہ بے حد ظالم اور حریص تھے انہوں نے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیے رکھا او رطرح طرح کے مظالم توڑے۔ ان مظالم سے تنگ آ کر ایک کشمیری پنڈت نے جس کا نام بیربل تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ کو تحریک کی کہ وہ کشمیر پر قابض ہو جائے۔ ۱۸۱۹ء میں کشمیر کو سکھ راج کا حصہ بنالیا گیا۔ سکھ ۲۷ سال تک یعنی ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک کشمیر پر مظالم توڑتے رہے ان کے دس گورنر کشمیر پر تعینات رہے۔ اس دور میں مذہبی آزادی سلب کی گئی۔ ٹیکس عائد کیے گئے۔ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے سکھ حکومت کا خاتمہ کر کے جموں وکشمیر کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا پھر ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ امرتسر کے تحت یہ ملک ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکوں کے بدلے گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا اس طرح یہ خطہ سکھوں کے قبضہ سے نکل کر ڈوگروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

ڈوگرہ خاندان ۱۸۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کشمیر پر قابض رہا۔ اس خاندان کے چار آدمی گلاب سنگھ، نیر سنگھ، پرتاب سنگھ اور ہری سنگھ ریاست جموں وکشمیر اور لداخ پر حکومت کرتے رہے۔ ان کا دور بدترین دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں کو اقتدار سے دور رکھا گیا اور جاگیردارانہ نظام قائم کیا گیا۔ مسلمان اگر مکان میں کھڑکی لگاتا تو اس پر بھی ٹیکس لگایا جاتا مال، مویشی، چولہے اور بیوی پر بھی ٹیکس تھا۔ عوام سے بیگار لی جاتی۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ آخری راجہ ہری سنگھ ۱۹۲۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس راجہ نے کچھ اصلاحات ضرور نافذ کیں لیکن مسلمانوں کے سیاسی، تمدنی اور مذہبی حقوق بدستور غصب کیے جاتے رہے جس کے نتیجے میں مسلمانان ریاست جموں وکشمیر نے ۱۹۳۱ء میں تحریک چلائی جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا تو ریاست کا ایک حصہ آزاد کرالیا گیا اور ایک کو سازش کے تحت بھارت کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

آج ریاست جموں وکشمیر ایک متنازعہ ریاست ہے اور اسے وہاں کے باشندوں کی خواہش کے مطابق آزاد ہونا ہے۔

سلطان زین العابدین بڈھ شاہ (۱۴۲۰ـ۷۰ء)

سلطان زین العابدین بڈھ شاہ شاہ میری خاندان کا عظیم سلطان ہو گزرا ہے۔ نصف صدی تک اس سلطان نے کشمیری عوام کو خوشحالی اور امن وسکون سے ہمکنار کیا۔ وہ اپنے دادا سلطان شہاب الدین کی طرح بہت بڑا فاتح تھا چنانچہ اس نے درہ زوجیلا کو پار کر کے لداخ اور پھر بلتستان کو فتح کیا۔ بڈھ شاہ نے صوبہ سرحد کے تاریخی مقام ھنڈ اور گردونواح کے علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ زین العابدین نے دوسرے ممالک کے حکمرانوں سے تعلقات قائم کیے اور خراسان وماوراالنہر میں اپنا سفیر بھیجا اور زعفران، کاغذ، مشک، شال اور بلور کے پیالے تحفے میں بھجوائے۔ تیمور کے بیٹے شاہرخ نے سلطان کے لیے ہاتھی اور قیمتی جواہرات بھیجے۔ شاہ رخ نے چھ سو علماء اور بہت سی کتابوں کے قلمی نسخے بھی بطور تحفہ پیش کیے۔ نوادرالاخبار نے اس کی تفصیل دی ہے کہا جاتا ہے شریف مکہ اور گیلان اور مصر کے حکمرانوں نے کشمیر کے اس عظیم سلطان کو تحائف بھیجے تھے۔ علاوہ ازیں اس نے سندھ، بنگال، تبت اور گجرات سے بھی تعلقات قائم کیے۔ سلطان زین العابدین کو اپنوں اور بیگانوں کی شدید بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے اپنی مشکلات پر اپنی خداداد صلاحیت اور ہمت سے قابو پالیا اسے قدرتی آفات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۴۶۰ء میں کشمیر میں شدید برف باری کی وجہ سے فصلیں تباہ ہو گئیں اور ملک میں قحط پھیل گیا۔ یہاں تک کہ لوگ درخت کے پتوں اور جڑوں پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے دو سال بعد دوسری مصیبت یوں ٹوٹی کہ مسلسل بارشوں کی وجہ سے سیلاب آیا اور انسان اور چوپائے اس میں بہہ گئے اور مکان تباہ ہو گئے۔ ان مشکلات پر بھی سلطان نے قابو پالیا اور اپنی حسن تدبیر سے عوام کو تباہی سے بچالیا۔ یہ سلطان صورت اور سیرت میں بے مثال تھا۔ شری ور نے جین چرت میں لکھا ہے کہ سلطان نرم مزاج تھا اور اسے غصہ کم آتا تھا۔ اسے مذہب سے فطری لگاؤ تھا اور نماز روزے کا پابند تھا، عیاش نہ تھا اور نہ ہی فضول خرچ تھا۔ پروفیسر محب الحسن نے لکھا ہے

کہ کسی اور کشمیری فرماں روا نے زین العابدین سے زیادہ کام رعایا کی فلاح وبہبود کے لیے نہیں کیا۔ وہ اکثر اوقات ملک کا دورہ کرتا اور افسروں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا، رشوت خوروں کو سزا دیتا اس نے زائد ٹیکسوں کو معاف کر دیا تھا۔ اس نے اشوک کی طرح اپنے قوانین تانبے کی پلیٹوں پر لکھوا کر گاؤں اور قصبوں میں لگوا دیے تھے۔ فرمان جاری کیا کہ تاجر سامان تجارت کا ذخیرہ نہ کریں۔ یہ عادل سلطان عدل وانصاف کا خیال رکھتا تھا۔ زین العابدین نے اس دور میں ڈاکوؤں کی پھانسی کی سزا ختم کر دی تھی بلکہ ان کو زنجیر میں باندھ کر سرکاری عمارتوں میں تعمیر میں لگایا جاتا تھا، غریبوں کے لیے سرکاری خزانے سے مخارج مقرر کیے۔ بڈھ شاہ کو زراعت سے دلچسپی تھی اس نے بہتے ہوئے جزیرے بنوائے جن پر فصل اگائی جاتی تھی۔ تالاب، نہریں اور بند باندھ کر آبپاشی کا نظام بہتر بنایا۔ محب الحسن نے اپنی تالیف ''کشمیر اسلامی عہد میں'' آبپاشی کے اس نظام کی تفصیل دی ہے۔

بڈھ شاہ کے دور حکومت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ منصفانہ اور رواداری کے کلچر کو فروغ دیا۔ ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی آزادی دی۔ توڑے ہوئے مندروں کو از سر نو تعمیر کرا دیا۔ وہ کبھی کبھی غیر مسلموں کے تہواروں پر ان کی تقریبات میں شرکت کرتا۔ غیر مسلموں کو اعلیٰ عہدے دیئے جاتے کیونکہ وہ آدمی کی ذاتی قابلیت کو پیش نظر رکھتا تھا۔

سلطان زین العابدین علم وادب کا زبردست سرپرست تھا۔ وہ علماء سے مکالمہ کرتا۔ علماء وشعراء کے لیے اس نے مہمان خانے قائم کیے۔ ہرات، سمرقند وغیرہ سے اہل علم اور اہل فن کو کشمیر بلوا کر آباد کیا۔ کئی پنڈت اس کے دربار سے منسلک تھے۔ سلطان نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا جس میں فارسی کی کتابیں سنسکرت میں اور سنسکرت کی کتابیں فارسی میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ سلطان تعلیم کی ترویج کے لیے منصوبے بناتا اور لوگوں کو تشویق کرتا تھا۔ اس نے نوشہر میں مدرسہ کھولا۔ مستحق طلباء کو وظائف دیئے۔ مدارس کے لیے جاگیریں وقف کیں۔ بڈھ شاہ نے کشمیر میں لائبریریاں قائم کیں وہ کتابوں کا شوقین تھا اس لیے آدمیوں کو ہندوستان، عراق اور ترکستان بھیجتا کہ وہاں سے قلمی نسخے خرید کر کشمیر لائیں۔ وہ خود بھی عالم اور شاعر تھا۔ کشمیری، سنسکرت، فارسی اور تبتی زبانیں جانتا تھا۔ فارسی زبان میں اس نے دو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اس سلطان اعظم نے کشمیر میں صنعت وحرفت کو بہت ترقی دی۔ اس نے کاغذ سازی اور جلد بندی کے فن کو متعارف کروایا۔ شال بافی اسی سلطان کے عہد میں مشہور

ہوئی۔ سلطان موسیقی کا شائق تھا، بودھ بھٹ اس کا درباری موسیقی دان تھا۔ ملا عودی لائق فنکار تھا۔ شیر پور ستار بجانے میں ماہر تھا۔

زین العابدین تعمیرات کا ماہر تھا۔ یہ اسی کا ذوق لطیف کا نتیجہ ہے کہ وادی میں بے شمار عمارات اس کے دور میں تعمیر ہوئیں جن میں مقبرے اور خانقاہیں بھی شامل ہیں۔ اس نے زین پور، زین کوٹ اور زین نگر کے قصبات اپنے نام پر آباد کیے، باغات لگوانے میں اس کو بڑی دلچسپی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کشمیر نے زین العابدین بڈھ شاہ جیسا دوسرا سلطان پیدا نہیں کیا۔ کشمیر کے اس یگانہ روزگار اور عوام دوست سلطان کو ہم کشمیر کا اکبر اعظم کہہ سکتے ہیں۔

کشمیر پر پچاس سال تک عدل وانصاف اور اعتدال پسندی کا نظام چلا کر سلطان زین العابدین ملقب بہ بڈھ شاہ۔ سلطان اعظم ۱۴۷۰ء میں فوت ہوا مگر اس کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

کشمیر بادشاہوں کی نظر میں

کشمیر کے حسن فطرت اور خوبی آب وہوا نے ہمیشہ سے ہی ملکی اور غیر ملکی شاعروں، سیاحوں اور بادشاہوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ قدیم زمانوں میں ہی اہل دل ونظر اس حسین خطہ ارضی کو فردوس دیدہ دل سمجھتے رہے ہیں۔ کشمیر کا نام دوسری صدی ہجری میں ترکستان وخراسان تک پہنچ چکا تھا۔ پانچویں صدی ہجری کے فارسی گو شعراء نے کشمیر کی تعریف میں جو اشعار کہے ان کو اگر جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور شاعر نظامی گنجوی نے کشمیر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

یکی گفتا کہ در اقصائے کشمیر
نباشد از لطافت ہیچ تقصیر
مقام خوبرویان آن زمین است
بخوبی رشک فردوس برین است

اردو میں ان اشعار کا ترجمہ یوں ہے کسی نے بتایا ہے کہ کشمیر میں حسن ولطافت کی کوئی کمی نہیں وہ سرزمین حسین لوگوں کا وطن ہے۔ کشمیر حسن وجمال میں فردوس بریں کے لیے موجب رشک ہے۔ مرزا حیدر دغلت نے کشمیر پر قبضہ کیا وہ اپنی تالیف تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے گرمی کے موسم میں ہوا کمال کی لطافت رکھتی ہے۔ سردی میں کمال اعتدال میں رہتی ہے۔ باوجود کثرت برف کے پوستین کی حاجت نہیں ہوتی۔ کشمیر ۱۵۸۶ء میں سلطنت مغلیہ کا حصہ بنا۔ مغل سلاطین اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگزیب کشمیر کے والہ وشیدا رہے۔ اکبر نے تین مرتبہ کشمیر کی سیاحت کی۔ پہلی بار وہ ۲۷ اپریل ۱۵۸۹ء کو اس سفر پر روانہ ہوا۔ اکبر بھمبر اور پیر پنجال کے راستے سفر کر کے ۵ جون کو سرینگر میں داخل ہوا اور جولائی کے اواخر تک وادی کی سیر کرتا رہا۔ اس نے پام پور بیج بہاڑہ، اننت ناگ، نندمرگ، اچھہ بل سوپور اور بارہ مولہ کی جی بھر کے اکبر نے دوسری بار

اکتوبر ۱۵۹۳ء میں کشمیر کا سفر نو کیا اور واپس مظفر آباد پکھلی کے راستے آیا۔ اکبر نے پام پور کا زعفران زار دیکھا تو پکار اٹھا:

ذوق فنا نیا فہہ ای ور نہ در نظر
رنگین تر از بہار فیضی خزاں

تجھے ذوق فنا نہیں ملا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کی خزاں بہار سے بڑھ کر رنگین ہے۔ اکبر کے تیسرے سفر کے دوران جو اپریل ۱۵۹۷ء کو کیا گیا۔ مشہور شاعر فیضی نے اس کے حضور قصیدہ پیش کیا۔ اس قصیدے کے تین اشعار اور پھر ان کا اردو ترجمہ دیکھیے:

فیضی کہتا ہے:

ہوائے او متنوع چو فکرت نقاش
زمین او متلون چو صفحہ تصویر
غبارا او خواند چشم را دارو
گیاہ او بتواں گفت روح را اکسیر
درو بجای گیاہ زعفراں ہمی روید
کہ آب و خاک طرب را چنین بود تاثیر

کشمیر کی ہوا فکر نقاش کی طرح متنوع ہے اور اس کی زمین البسم کی مانند رنگا رنگ ہے۔ کشمیر کی دھول کو آنکھ کا سرمہ اور اس کی گھاس پھونس کو روح کے لیے اکسیر کہا جا سکتا ہے۔ کشمیر میں گھاس کی جگہ زعفران اگتا ہے کیونکہ اس وادی کی طرب انگیز آب و خاک کی تاثیر ایسی ہی ہے۔

جہانگیر بادشاہ سرینگر کی تعریف میں یوں گویا ہوتا ہے:

شہر کا نام سرینگر ہے۔ دریائے جہلم اس کے درمیان سے گزرتا ہے۔ یہ دریا چشمہ ویری ناگ سے نکلتا ہے، جہانگیر اپنی توزک میں رقمطراز ہے۔

کشمیر باغیست ہمیشہ بہار یا قلعہ ایست آہنی حصار۔

بادشاہاں را گلشن است عشرت افزا و درویشان را خلوت کدہ دل کشا۔

کشمیر ایک ایسا باغ ہے جہاں بہار ہمیشہ رہتی ہے یا پھر ایک قلعہ ہے جس کی دیواریں لوہے کی ہیں۔ کشمیر بادشاہوں کے لیے عشرت افزا گلشن ہے اور درویشوں کے واسطے ایک دل کشا خلوت کدہ:

جہانگیر بادشاہ نے ۱۶۳۰ء کا جشن نوروز مظفرآباد میں دریائے نیلم کے کنارے منایا تھا۔ اسے نزع کے وقت بھی کشمیر دیکھنے کی حسرت رہی ملاطفرا مشہدی نے یہ واقعہ اس شعر میں بیان کیا ہے:

از شاہ جہانگیر دم نزع چو جستند
باحسرت دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

جب جہانگیر سے دم نزع پوچھا گیا تو اس نے حسرت سے آہ بھری اور کہا۔ بس ایک خواہش ہے کشمیر اور کچھ نہیں۔ شاہجہان نے چار مرتبہ کشمیر کی سیاحت کی۔ شاہجہان نے سرینگر کو باغوں سے سجا کر عروس البلاد بنا دیا تھا۔ اورنگزیب کشمیر کی شان میں کہتا ہے۔

کشمیری لوگ شاعری اور علوم میں ایرانیوں سے کم نہیں:

کشمیر برصغیر کی جنت ارضی ہے

کشمیر یورپی اہل قلم کی تحریروں میں

کشمیر وہ جنت ارضی ہے جس کو دیکھنے کی آرزو ہر سیاح کرتا رہا اور جس کے حسن فطرت پر ہر قلم کار نے قلم اٹھایا ہے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، جرمنی اور انگریزی وہ معروف عالمی زبانیں ہیں جن میں کشمیر اور باشندگان پر روقیع مواد مل جاتا ہے۔ اس گفتگو میں میں چاہتا ہوں کہ چندان یورپی مورخین و محققین کا تذکرہ کر دیا جائے جو کشمیر دیکھنے کے لیے یہاں آئے اور اپنی تحقیقات و مشاہدات کا ایک ایسا مواد چھوڑ گئے جو آج بھی اتنا ہی اہم ہے جو اس وقت بھی تھا جب یہ تحریر کیا جا رہا تھا۔ یہ کہانی ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے کشمیر کے ہمسایہ ملک چین سے ایک شہرہ آفاق سیاح ھیون سانگ یہاں ۶۳۱ء میں آیا۔ اس کا سفرنامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ھیون سانگ نے کشمیر کی دلچسپ اور خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ دوسرا سیاح اٹلی کا مارکو پولو ہے اس نے بھی اپنے سیاحت نامہ میں زمانہ قدیم کے تناظر میں کشمیر کے تاریخی نقش و نگار اجاگر کیے ہیں۔

پروفیسر محب الحسن مرحوم کی تحقیق یہ ہے کہ کشمیر کی سرزمین پر قدم رکھنے والا پہلا یورپی سیاح فادر جیروم زیویر تھا جو اکبر کے ہمراہ ۱۵۹۷ء میں کشمیر آیا۔ اس سیاح نے کشمیر پر مفید تاثرات چھوڑے ہیں۔ فرانسسکو پلسرٹ نے بھی اپنے سیاحت نامے میں اس خطہ گل و لالہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور سیاح فرانکوئی برنیر اورنگزیب کے ساتھ ۱۶۶۴ء میں کشمیر کو سیر کرنے آیا تھا اس نے اپنے سفرنامے میں جو ٹریولز ان دی مغل ایمپائر کے نام سے شائع ہو گیا ہے کشمیری عوام کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی کی تصویر کشی کی ہے نیز فادر ڈیسڈری نے جو تفصیلات اس عہد کے کشمیر سے متعلق فراہم کر دی ہیں وہ بڑی مفید ہیں۔

جارج فارسٹر تیمور شاہ درانی کے عہد حکومت یعنی ۱۷۸۳ء میں کشمیر میں آیا۔ ڈاکٹر ایم۔ ایس ناز لکھتے ہیں کہ جارج ٹیرمبک اور ولیم مور کرافٹ نے پہلے لداخ کی سیاحت کی اور پھر وہاں سے ۱۸۱۹ء میں وادی کشمیر میں پہنچے۔ مور کرافٹ کا سفرنامہ ڈٹریولز ان لداخ اینڈ کشمیر شائع ہو چکا ہے۔

اس وقت کشمیر پر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ اس کے دس سال بعد ۱۸۳۱ء میں وکٹر جیکو ٹی مانٹ خطہ کشمیر کی سیاحت کی غرض سے یہاں آیا۔ فان ھیوگل اور وائن ۱۸۳۵ء میں کشمیر آئے۔ ان دونوں سیاحوں نے کشمیر پر بہترین تاریخی ومعاشرتی معلومات فراہم کردی ہیں۔ کشمیر کے جغرافیہ اور جیالوجی پر اودیسٹریچ اور لڈکر نے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ ڈریو کا کام ایک مستند حوالے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ معروف جغرافیہ دان اے۔ کننگھم نے انشینٹ جغرافی آف انڈیا میں کشمیر کا جغرافیہ پیش کیا ہے۔ سر والٹر لارنس نے اپنی تالیف ''دی ویلی آف کشمیر'' میں وادی کی معاشرت، تہذیب، ثقافت اور ذاتوں کے بارے میں بہترین مواد پیش کر دیا ہے۔ اس تالیف کو کشمیر کا دائرۃ المعارف کہا جا سکتا ہے۔

سر آر ڈبلیو آرنلڈ نے دی پریچنگ آف اسلام میں ان واقعات کو بیان کیا ہے جب کشمیر میں دین اسلام متعارف ہوا۔ ماہر لسانیات جارج ابراہام گرائرسن نے لینگوسٹک سروے آف انڈیا میں کشمیر کی زبانوں، کشمیری، گوجری، پہاڑی وغیرہ پر مفصل بحث کی ہے، ایک اور ادیب سر فرانسس ینگ ھسبینڈ نے اپنی اہم تالیف ''کشمیر'' میں خطہ کشمیر کا عمدہ تعارف کروایا ہے۔ سموئیل بیل نے اکاؤنٹس آف انڈیا میں اس عہد کے کشمیر پر روشنی ڈالی ہے، کشمیری زبان کی کہانیوں کو لارنس نولز نے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے، کشمیری زبان کی صوفی شاعرہ اور اللہ عارفہ کے گیتوں کا ترجمہ رچرڈ ٹمپل نے کیا ہے جو کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ اے سٹائن معروف یورپی مورخ مترجم اور جغرافیہ دان تھا۔ سٹائن نے ابوالمورخین پنڈت کلہن کی راج ترنگنی کا سنسکرت سے نہ صرف انگریزی میں ترجمہ کیا بلکہ تاریخی واقعات کی تفصیل دی اور ان مقامات کی نشاندہی بھی کی جن کا ذکر راج ترنگنی مولفہ ۱۱۴۹ء میں کیا گیا تھا۔ یہ ایک اجمالی خاکہ تھا ان یورپی اہل قلم کی کاوشوں کا جنھوں نے کشمیر کو اپنا موضوع تحقیق بنایا۔ اس کی کم تفصیل تم جو پوچھو قصہ طولانی ہے۔

کشمیر فارسی شعراء کی نظر میں

ایران کے ساسانی عہد کے فارسی شعراء کے کلام میں کشمیر کا ذکر ملتا ہے۔ ۵۰۰ء کے ایک شاعر بہرامی سرخسی خراسان کے سرو اور کشمیر کے نگار کی تعریف میں کہتا ہے:

نہ دیدی نہ بینی چو روی تو قدش
نگاری بہ کشمیر و سروی بہ کشمیر

اے محبوب تمہارے قد کی مانند نہ کشمیر خراسان میں کوئی سرو ملے گا اور نہ ہی کشمیر میں کوئی دراز قد معشوق۔

اسی طرح ۵۴۲ء کا شاعر امیر معزی کہتا ہے:

بلند قامت ایشان چو سرو در کشمیر
بدیع صورت ایشان چو نقش در کشمیر

ان کا قد ایران کے کشمیر کے سرو کی طرح ہے اور ان کی صورت زیبا کشمیر کی نقاشی کی مانند ساسانی دور میں عمارہ مروزی۔ فرخی، سیستانی، عنصری، قطران تبریزی، عمعق بخارائی، منوچہری اور انوری جیسے باکمال ایرانی شاعروں نے کشمیر کی تعریف میں قصیدے لکھے۔ شہرہ آفاق شاعر جو حافظ شیرازی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کا عہد ۷۲۶ء تا ۷۹۱ء ہے ایک خوبصورت شعر میں فرماتے ہیں کہ ہماری شاعری پر سیاہ چشمان کشمیر رقص کرتے ہیں:

بشعر حافظ شیرازی رقصند ومی نازند
سیاہ چشمان کشمیری وتر کان سمرقندی

اس شعر میں اہل کشمیر کو جہاں سیاہ چشمان کہا گیا ہے وہاں یہ بھی بتایا گیا کہ حافظ کا شعر آٹھویں صدی ہجری میں کشمیر میں مقبول ہو چکا تھا۔

مغلوں کے عہد میں درجنوں ایرانی شاعر دہلی، آگرہ اور لاہور آئے اور بعض نے کشمیر کی سیر بھی کی اور کشمیر کے حسن فطرت میں رطب اللساں ہوئے۔

معروف شاعر طالب آملی اکبر کے عہد میں مازندران سے ہند آیا۔ لاہور سے ہوتا ہوا سرزمین گل ولالہ کشمیر میں پہنچا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

وہ کہتا ہے:

کشمیری ستانم از حق بجائے جنت
امانمی ستانم جنت بجائے کشمیر

میں اللہ تعالیٰ سے جنت کی جگہ کشمیر چاہتا ہوں لیکن کشمیر دے کر جنت نہیں لینا چاہتا۔
شاہجہان کا درباری شاعر ابو طالب کلیم فردوس برروئے زمیں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

اگرچہ پایہ دل بستگی است قامت سرو
عنان ہوش بدست چنار۔کشمیر است

اگر چہ سرو کی قامت دل بستگی کی بنیاد ہے لیکن میری ہوش وحواس کی زمام تو کشمیر کے چنار کے ہاتھ میں ہے۔صائب نے ہر سوختہ جانی کی بکشمیر درآید گر مرغ کباب است کہ بابال وپر آید کشمیر میں اگر بھنا ہوا مرغ بھی لایا جائے تو وہ بال وپر نکالنے لگے:
حاجی جان محمد قدسی نے شاہجہان کے شفر کشمیر کے واقعات نظم کیے تھے۔قدسی کی مثنوی سے یہ شعر سنیے:

خوشا کشمیر و خاک پاک کشمیر
کہ سر برزد بہشت از خاک کشمیر

کشمیر اور اس کی خاک پاک کے کیا کہنے بہشت تو کشمیر کی مٹی سے ہی ظہور پذیر ہوا۔
نواب ظفر خان احسن نے کشمیر کی ان الفاظ میں تعریف کی:

خوشا کشمیر وایام خزانش
خوشا کشمیر و فصل زعفرانش

کشمیر اور موسم خزاں کے کیا کہنے۔کشمیر اور اس کی فصل زعفران کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ملا طاہر غنی کشمیر کا ایک عظیم فارسی گو شاعر ہو گزرا ہے۔غنی کہتا ہے:

کشمیر از صباحت روشن گر جمال است
حسن سیاہ آنجا گرہست خال خال است

کشمیر لطافت وصباحت کے سبب حسن وجمال کو دو چند کرتا ہے۔اس کشور میں اگر گندم گوں لوگ ہوں بھی تو وہ خال خال ہی ہیں۔مرزا داراب گویا کشمیر کا حسن اس طرح بیان کرتا ہے:

دراین گلشن کہ باد آباد جاوید
لطافت را مجسم می توان دید

اس گلشن میں جو ہمیشہ آباد رہے مجسم حسن ولطافت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مشتاق رضا کی غزل کا یہ شعر قابل داد ہے:

آبروی جہاں و ہرچہ و روست
خاک پاک دیار کشمیر است

جہان اور جہان والوں کی آبرو دیار کشمیر ہی کی خاک پاک ہے اور آخر میں علامہ اقبال کی ایک خوبصورت غزل کے یہ اشعار:

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل ودمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج برسر نارون نگر
لالہ زخاک بردمید موج بہ آبجو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

ترجمہ یوں ہے وادی کشمیر میں بستر بچھالے کوہ ودمن کی سیر کر ہر جگہ سبزہ دیکھ ہر باغ میں گل لالہ کی بہار سے لطف اٹھا وادی میں باد بہاری لہر لہر چلتی ہے۔ بہار کے پرندے ڈار ڈار اڑتے ہیں۔ نارون کے پیڑوں پر پرندوں کے جوڑے دیکھ گل لالہ خاک سے اگا ہے پانی کی موج نہر میں چمک رہی ہے۔ مٹی سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور پانی کی سطح پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔

میں آخر میں اس گفتگو کو اپنے اس فارسی شعر پر ختم کرتا ہوں جس کا ترجمہ یہ ہے:

گشتم از کشمیر تا کاشان من
خالی از عشق تو یک کاشانہ نیست

میں نے کشمیر سے کاشان تک گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ ایک گھر بھی ایسا نہ پایا جو تیرے عشق سے خالی ہو۔

کشمیر اردو شعراء کی نظر میں

کشمیر بہشت برروئے زمیں کی تعریف جہاں سیاحوں، بادشاہوں اور فارسی کے شاعروں نے کی ہے وہاں اردو کے شعراء بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ بیسویں صدی کے تقریباً سبھی شاعروں نے کشمیر کے حسن و لطافت، آب و ہوا اور طبعی مناظر کے حوالے سے نظمیں کہی ہیں۔ کشمیر اردو شاعری کے آسمان میں ایک درخشاں آفتاب بن کر چمکتا رہا ہے۔ بعض شعراء نے کشمیر پر اپنے کلام کے مستقل مجموعے شائع کیے ہیں۔ ڈوگرہ اور سکھ حکمرانوں کے مظالم کی داستانیں ہماری اردو شاعری کا عنوان ہیں۔ کشمیر سے منسوب اردو کا مزاحمتی ادب اور شاعری بہترین شعرو ادب قرار پایا ہے۔ میں آج کی گفتگو میں غیر منقسم ہندوستان، پاکستان، جموں وکشمیر اور آزاد کشمیر کے چند شاعروں کے کلام سے نمونے پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ کلام کشمیر کی خوبصورتی کا عکاس ہے اور مظلوم کشمیریوں کی غلامی کا نوحہ بھی۔ پنڈت برج نرائن چکسبت کشمیر کے پہاڑی چشموں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

پروفیسر اکرم منیر نے ۱۹۲۷ء میں کشمیر کی سیاحت کی اور ساقی نامہ لکھا۔ ساقی نامہ کے یہ اشعار کتنے دل آویز ہیں:

دل آویز کشمیر کی سرزمیں ہے، بساط گل و لالہ و یاسمیں ہے
یہ الماس خاتم زمردنگیں ہے، بہار آشنا ہے بہار آفریں ہے

میر ولی اللہ ایبٹ آبادی کشمیر الاصل محقق اور شاعر تھے۔ کشمیر کے نشاط باغ پر ان کے یہ اشعار سماعت فرمائیے:

نشاط باغ کی ہے وہ نظر فریب بہار
کہ جس کو دیکھ کے دل میں خروش پیدا ہوا

ہر آبشار کی موجوں سے اور نغموں سے
بہشت دیدہ و فردوس گوش پیدا ہو

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دھلوی معروف شاعر محقق اور ماہر لسانیات تھے۔کیفی کشمیر کی تعریف میں اس طرح گویا ہوئے:

ایک سے اک بڑھ کے ملتے ہیں مناظر دل فریب
دیکھو وادی میں جدھر جاؤ جہاں کہسار میں
پھول ہیں چشمے ہیں میوے کے شجر اور مرغزار
چپہ چپہ دب رہا ہے لطف حق کے بار میں

منشی محمد دین فوق شاعر محقق نساب مورخ اور دلدادہ کشمیر تھے۔فرماتے ہیں۔
دامن قرار دل کے سب تار تار دیکھے، جب تیری وادیوں کے کچھ آبشار دیکھے جس نے تیری خزاں کے ایسے نکھار دیکھے، گلزار خلد کی پھر وہ کیا بہار دیکھے ان کا یہ شعر کتنا بلیغ ہے:

کشمیر کو ہم چھوڑ کے کیوں جائیں کہیں اور
کیا اس کے سوا ہے کوئی فردوس بریں اور

جنت کشمیر کا حسن ڈل کے پانی میں سمٹ آیا ہے۔اقبال کشن کے یہ سحر آفریں اشعار دیکھیے:

اللہ اللہ رے کشمیر کی تاثیر بہار
پتی پتی ہے ہر اک پھول کی تصویر بہار
ڈل کے پھولوں پہ شب ماہ نے برسایا نور
موسم گل میں چمک اٹھی ہے تصویر بہار

جیالال کول برق کاشمیری اس خطہ کے قدرتی نظاروں سے باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے:

ختم ہیں رعنائیاں سب حسن فطرت کی یہاں
جلوہ گر نیرنگیاں ہیں ساری قدرت کی یہاں

پنڈت نند لعل کول طالب سرینگر کے باغوں کو دیکھنے کی مسرت میں کہتے ہیں:

مدت سے آرزو تھی لطف بہار دیکھوں

کاشانہ چمن کے نقش و نگار دیکھوں
باغ نشاط میں ہو دل کو نشاط حاصل
تازہ نسیم ڈل ہو اور شالامار دیکھوں

چوہدری خوشی محمد ناظر مولانا شبلی، حالی، محسن الملک اور سرسید احمد خاں کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے تھے۔ کشمیر میں ملازمت کرتے رہے۔ نامور شاعر تھے، ان کی نظم جوگی بے حد مشہور ہوئی ہے۔ ڈل جھیل پر خوشی محمد ناظر کی نظم کے یہ آبدار اشعار زبان و بیان پر ان کی قدرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

اللہ اللہ ہے حسن چمن پانی میں
سبزہ و لالہ و گل سرو وسمن پانی میں
کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اس کے
کوہ پانی میں چمن پانی میں بن پانی میں
ہیں شکارے میں سیہ چشم تبان کشمیر
یا اترتے ہیں غزالان ختن پانی میں

ترانہ پاکستان کے خالق اور شاہنامہ اسلام کے مصنف حفیظ جالندھری کو کشمیر سے خاص تعلق خاطر رہا۔ کشمیر ان کی شاعری کا موضوع اور کشمیری ان کی تحریروں کا عنوان بن گیا تھا۔ تصویر کشمیر حفیظ کی معرکتہ الآرا نظم ہے جس میں حفیظ نے جہاں حسن کشمیر کی تصویر کشی کی ہے وہاں آزادی کا پیغام بھی دیا گیا ہے:

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بو کی شوخیاں پھولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیواروں کی بزم آرائیاں
بنتے بنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں

آگے پیچھے دوڑتا تاریکی وتنویر کا (ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا)۔

ہدایت اللہ اختر جموں کے شاعر تھے کہتے ہیں:

کشمیر کی از تاب سمن پوش فضائیں
فردوس کی مہکی ہوئی شاداب ہوائیں

جھیلیں لئے دامن میں زمانے کا تقدس
تاریخ کے معصوم فسانے کا تقدس

جموں کے نامور شاعر قیس شروانی کا انداز تحسین یہ ہے:

حسن کے پھر جلوہ فرمانے کا موسم آ گیا
پھر دل و دیدہ کے بہلانے کا موسم آ گیا

شیخ غلام علی بلبل جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

اپنے گھر کے سامنے صدیوں کا وہ بوڑھا چنار
بیٹھے بیٹھے آج مجھ کو دفعتہ یاد آ گیا

جموں کے جمیل نظامی کہتے ہیں:

میرے وطن کا جہاں میں کوئی جواب نہیں
وہی وطن کہ حقیقت ہے کوئی خواب نہیں

گوجری کا انقلابی شاعر اسرائیل مجبور وطن کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

وہ بھدرواہ کی زرخیز وادی، وہ ڈوڈہ کی نشاط انگیز وادی
بھلیر کی طرب انگیز وادی، چنبنی کی وہ راحت خیز وادی
نظیر اس کی نہ دنیا میں کہیں ہے، یہی مرے وطن کی سرزمین ہے۔

جن شاعروں کا کلام میں خوف طوالت سے پیش نہ کر سکا ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں احمد شمیم، تحسین جعفری، قمر قمرازی، رسا بھدرواہی، الطاف قریشی، مسعود قریشی، رفیق خاور، جعفر طاہر، نذیر تبسم، رفیق بھٹی، آمنہ بہار، افتخار مغل، آصف ثاقب، سلطان سکون، ایم یامین، مخلص وجدانی، اعجاز نعمانی، شفیق راجہ ابراہیم گل وغیرہ اور آخر میں میرا اپنا شعر:

مرے ہی گیت قمری و کوکو کے لب پہ ہیں!
پرجوش ساری وادی گل ریز مجھ سے ہے

ریاست جموں وکشمیر کی زبانیں

ریاست جموں وکشمیر اور لداخ میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جموں میں ڈوگری زبان مروج ہے اور اس کے لکھاریوں نے شاعری، نثر، تنقید، افسانہ اور ڈرامہ پر مشتمل بھرپور ادب تخلیق کر کے اسے مالا مال کر دیا ہے۔ ڈوگری زبان سے کافی ملتی جلتی بولی آزاد کشمیر کی تحصیل سدھنوتی اور گلیات مری کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ سیالکوٹ سے اس پار اکھنور، کھٹوعہ اور سانبہ کے علاقوں میں پنجابی کا چلن ہے۔ اس سے اوپر بھدرواہ میں ایک بولی کا رواج ہے جسے بھدرواہی کہتے ہیں۔ لداخ میں لداخی بولی کا بول بالا ہے اس میں تحریری ادب ملتا ہے۔ اردو ریاست جموں وکشمیر کی ملی اور رابطے کی زبان ہے۔ اردو بیسویں صدی کے شروع میں ریاست میں ان سرکاری ملازمین کے ذریعے آئی جو پنجاب اور یوپی سے بسلسلہ ملازمت یہاں آئے تھے، آہستہ آہستہ اردو اخبارات نکلنے لگے۔ ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔ مشاعرے ہونے لگے اور پھر تعلیمی اداروں کے نصاب میں اردو کو داخل کر لیا گیا۔ آج جموں سے لداخ تک ایسا کوئی علاقہ نہیں جہاں اردو سمجھی اور بولی نہ جاتی ہو۔ کشمیر نے اردو کے نامور شاعروں، افسانہ نویسوں اور ادیبوں کو جنم دیا ہے جن میں کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری، فاروق نازکی، حکیم منظور سا بھدرواہی، ایمن کامل، غلام رسول نازکی، محمود ہاشمی وغیرہ جیسے بڑے اہل قلم شامل ہیں۔ وسعت کے لحاظ سے ریاست جموں وکشمیر کی بڑی زبانیں تین ہیں۔ کشمیری، گوجری اور پہاڑی۔ کشمیری وادی کشمیر کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ آج سے سترہ سو سال پہلے دردزبانوں کے ملاپ سے کشمیری پیدا ہوئی۔ یہ زبان شاعری، لوک گیت، لوک کہانیوں کے لحاظ سے بڑی ثروت مند زبان ہے۔ للہ عارفہ، نورالدین رشی، حبہ خاتون، وہاب پرے محمود گامی، مقبول کرالہ واری، رسل میر، شمس فقیر، غلام احمد مہجور اور عبدالاحد آزاد جیسے عظیم شاعروں نے اس زبان کے ادب کو غنی بنایا یارؤف، ونہ ون، چھکری، لڑی شاہ اور بانتر بانٹھ کشمیری کی لوک شاعری کا نمونہ ہیں۔ کشمیری کا نثری ادب بھی وافر ہے۔ آج کشمیری بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔

پہاڑی صوبہ جموں اور کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ آزاد کشمیر میں بھی پہاڑی کا چلن ہے۔ پہاڑی کے کچھ شعری نمونے ملتے ہیں لیکن نثر میں اس نے ترقی نہیں کی۔ آزادی کے بعد ریڈیو کشمیر سرینگر تراڑکھل مظفرآباد سے پہاڑی کی نشریات کا آغاز ہوا۔ سرینگر اکیڈمی میں پہاڑی کا شعبہ قائم ہوا جس کے تحت تحقیق اور تخلیقی کام ہو رہا ہے۔ آزاد کشمیر میں میرپور، راولاکوٹ اور مظفرآباد میں پہاڑی پر تھوڑا بہت کام ہو رہا ہے لیکن کوئی بڑا محقق یا شاعر سامنے نہیں آیا۔ میرپور میں ڈاکٹر محسن شکیل پہاڑی کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ پہاڑی موسیقی میں جوڑئی بن جھلی پچنگ ڈھول خاص آلات موسیقی ہیں۔ گوجری ان آریائی قبائل کی زبان ہے جو تین ہزار سال پہلے جارجیا وغیرہ سے ہجرت کر کے برصغیر میں آئے تھے۔ اس زبان نے کوہ آراولی اور کوہ آبو کے علاقوں میں چھٹی صدی عیسوی میں جنم لیا پھر گوجری کاٹھیاواڑ دکن دہلی، آگرہ اور متھرا میں پہنچی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں گوجروں کی حکومت کی حدود کابل سے کرناٹک تک تھیں۔ گجرات کے قدیم صوفیاء اور شعراء گوجری میں ہی ادب تخلیق کرتے رہے۔ بعد کے ادوار میں جب گوجر قبائل پنجاب اور ریاست جموں وکشمیر، ہزارہ، سوات اور افغانستان میں پہنچے تو گوجری کو علاقائی وسعت حاصل ہوئی۔ گوجری سے اردو زبان نے جنم لیا یہاں تک کہ شروع میں اردو کو گوجری کہا جانے لگا۔ گوجری برصغیر کی وہ واحد زبان ہے جو کسی ایک علاقے سے مخصوص نہیں۔ یہ برصغیر کی ایک عمومی اور رابطے کی زبان ہے۔ گوجری زبان کا اثر راجستانی، سندھی اور پنجابی پر نمایاں ہے۔ گوجر ہر دور میں بیرونی حملہ آوروں سے نبردآزما رہے اس لیے گوجر کا تحریری ادب درمیان کے عہد میں گوشہ گمنائی میں رہا۔ انیسویں صدی کے شروع میں گوجری کے شاعروں نے سہ حرفی کی شاعری کے نمونے پیش کیے۔ گوجری زبان کے شعر و ادب کا اصل آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوتا ہے جب آزاد کشمیر جموں اور سرینگر کے تعلیم یافتہ افراد جدید شاعری اور جدید نثر کی تخلیق کرنے لگے۔ اب تک گوجری شاعری کے پچاس سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تراڑکھل، مظفرآباد، میرپور جموں، پونچھ اور سرینگر کے ریڈیو اسٹیشن گوجری میں پروگرام نشر کرتے ہیں۔ کشمیر اکیڈمی سرینگر میں گوجری کا شعبہ قائم ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن اسٹیشن اسلام آباد سے گوجری میں خبریں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ بتاتا چلوں کہ گوجری میں میرے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں میرا مجموعہ ''کیسر کیاری'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

کشمیری زبان

کشمیری زبان جسے اہل زبان کاشر کہتے ہیں قدیم زبان ہے جو وادی کشمیر کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل یہ وادی ایک جھیل تھی پھر بہ مرور زمانی جب جھیل خشک ہو کر سرسبز وخرم ہوگئی اور فردوس برروئے زمین کہلائی تو گریز استور بلتستان، لداخ، گلگت، چلاس اور چترال کے قبائل یہاں آ کر آباد ہو گئے یہ قبائل دردآریائی زبان بولتے تھے یعنی شینا، بلتی، چترالی، بروشکی، کوہستانی وغیرہ۔ چنانچہ مختلف قبائل کے میل جول اور باہمی معاشرت کے نتیجہ میں کشمیری زبان وجود میں آئی۔ محققین کا خیال یہ ہے کہ آج سے سترہ سو سال پہلے کشمیر میں اپ بھرنش بھاشا کا چلن ہوا اور اس کے بعد کشمیری زبان نے جنم لیا گویا کشمیری زبان کی پیدائش کا زمانہ تیسری صدی عیسوی ٹھہرتا ہے۔ گرائرسن، جیالال اور عبدالاحد آزاد نے ثابت کیا ہے کہ کشمیری درد زبانوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی جن میں پشاچہ زبان قابل ذکر ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ دالردی زبانوں نے کشمیری کا پیکر تراشا اور فارسی نے اس میں روح پھونکی اس طرح یہ چمن مختلف پانیوں سے سیراب ہو کر مہکنے لگا۔ اس وقت تک مہانیہ پرکاش کشمیری کی قدیم ترین تخلیق سمجھی جاتی ہے۔ جو تیرھویں صدی عیسوی میں تصنیف ہوئی۔ کشمیری کا دوسرا دور ۱۳۳۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ للہ عارفہ یا للہ ویداور شیخ نورالدین ریشی اس دور کے بڑے شاعر گنے جاتے ہیں۔ ان دونوں شاعروں نے صوفیانہ اور نیم فلسفیانہ گیت یادگار چھوڑے ہیں۔ شیخ نورالدین کا کشمیری کلام اسی طرح کشمیر میں مقبول ہے جس طرح شاہ لطیف کا کلام سندھ میں پسند کیا جاتا ہے۔

کشمیری شعروادب کا تیسرا دور ۱۴۲۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے نمائندہ شعراء حبہ خاتون، حبیب اللہ نوشہری اور ارنی مال ہیں۔ اس عہد میں کشمیری میں فارسی لغات، تراکیب، تلمیحات اور اوزان وبحور استعمال ہونے لگے۔ یہ عاشقانہ شاعری کا دور کہلاتا ہے۔ دور چہارم کا آغاز ۱۸۴۸ء سے ہوا۔ مقبول کرالہ واری، محمود گامی، عبدالوہاب پرے، عزیز اللہ حقانی جیسے باکمال

مثنوی گو اس دور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فارسی کی مشہور داستانوں کو کشمیری کا جامہ پہنایا۔ مقبول کرالہ واری نظامی کشمیر کہلاتا ہے اور اس کی ''مثنوی گلریز'' کشمیری شاعری کا شاہکار ہے۔ رسل میر شاہ آبادی، شمس فقیر اور رحمان ڈار کا تعلق انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے۔ ان تینوں بڑے شاعروں نے کشمیری غزل کے گیسو کی شانہ گری کی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی تیس برسوں میں اخلاقی شاعری میں نادم کرشن، رازدان اور میر ثناء اللہ کریری نے تصوف میں اور رزمیہ شاعری میں امیر شاہ کریری نے نام پیدا کیا۔ کشمیری شاعری کا دور پنجم ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دراصل کشمیریوں کی سیاسی بیداری کا دور ہے اس دور میں اہل کشمیر نے علامہ اقبال اور قائداعظم کے افکار سے رہنمائی حاصل کی اور تحریک آزادی کا آغاز کیا۔ اس دور کے بانی کشمیری کے عظیم شاعر جناب غلام احمد مہجور ہیں۔ کشمیر کے انقلابی شاعر عبدالاحد آزاد بھی اسی دور میں آفتاب بن کر ابھرے۔ آزاد نے امن، انسان دوستی، ترقی اور اتحاد کا درس دیا۔ مہجور نے اپنے عاشقانہ کلام کے ذریعے قوم کو ولولہ تازہ دیا۔ مہجور کے عہد میں جن دیگر شعراء نے اپنی حیات بخش شاعری کے ذریعے ملت کو جوش و جذبہ اور نیا شعور دیا ان میں دینا ناتھ، نادم، غلام رسول نازکی، غلام نبی فراق، رسا بھدرواہی، پروفیسر امین کامل، مظفر عازم اور رحمان راھی کا نام سرفہرست ہے۔

یہاں آزاد خطہ میں کشمیری زبان وادب کی تاریخ کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں رہی تاہم حضرت میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ کا کشمیری میں ترجمہ قرآن کشمیری نثر کا بہترین نمونہ گردانا گیا ہے۔ شاعری میں آزاد کشمیر کے جن شاعروں نے اپنے کلام کے ذریعے کشمیری کو ترقی دی ان کے نام اس طرح ہیں۔ ناز کولگامی، احمد شمیم، تحسین جعفری، خواجہ عبدالصمد وانی، میر عبدالعزیز، ڈاکٹر یوسف بخاری، میر غلام احمد کشفی، طاؤس بانہالی اور مقصود جعفری کشمیری کے یہ اہل قلم اردو کے نامور ادیب بھی تھے، ناز کولگامی نے اقبال کے ایک مجموعہ کا ترجمہ کشمیری میں کیا۔ احمد شمیم نے اردو میں کمال کی شاعری کی ہے۔ خواجہ عبدالصمد وانی ماہر کشمیریات ادیب اور صحافی تھے۔ میر عبدالعزیز نے کشمیری کے قواعد لکھے۔ ڈاکٹر یوسف بخاری کی کوششوں سے پنجاب یونیورسٹی شعبہ کشمیریات کا قیام عمل میں آیا۔ بخاری صاحب نقاد، مورخ، ڈرامہ نگار اور مترجم ہیں۔ طاؤس بانہالی کشمیری کے علاوہ اردو کے ادیب بھی تھے۔ آپ زندگی بھر ریڈیو سے وابستہ رہے۔ شعبہ کشمیریات کی نصرت نثار صاحبہ اور محمد اشرف قریشی اور دیگر اساتذہ بہترین طور پر کشمیری زبان اور کشمیری ثقافت کے تحفظ و ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔

کشمیری زبان کی دو عظیم شاعرات

خطہ کشمیر نے کئی حوالوں سے ایسی خواتین کو جنم دیا جو نامور ہوئیں۔ کشمیری زبان کی شاعری میں للہ عارفہ، حبہ خاتون، روپا بھوانی اور ارنی مال آسمان شعروادب پر آفتاب بن کر چمکیں۔ کشمیری کی زبردست صوفی شاعرہ للہ عارفہ کو کون نہیں جانتا۔ وہ میرا بائی اور ایران کی قرۃ العین طاہرہ کی طرح مشہور ہوئی۔ یہ شاعری تمام قوموں میں محترم رہی۔ ہندو اسے لل ایشوری اور لل دید کے نام سے پکارتے ہیں۔ کشمیری اسے لل ماج کہتے ہیں۔ للہ دید ایک عارفہ تھی اس لیے مسلمان اسے لالہ عارفہ کہتے ہیں جو سید حسین سمنانی کے ذریعے مسلمان ہوئی۔ للہ عارفہ ۱۳۳۵ء میں سرینگر کے نزدیک ایک گاؤں پارتھن میں پیدا ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں ایک ان پڑھ زمیندار سے شادی کرادی گئی۔ وہ بے حد ظالم تھا۔ اس سے نباہ نہ ہوا تو للہ عارفہ نے درویشی کا لباس پہن لیا اور فکر و ذکر میں رہنے لگی۔ للہ عارفہ کشمیری زبان کی باکمال شاعرہ تھی۔ اس کے گیت بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اس نے بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی اور توحید کا درس دیا۔ اس کا کلام معرفت اور حکمت کا ترجمان ہے۔ للہ عارفہ کے ایک کشمیری گیت کا ترجمہ یوں ہے۔

میں نے تجھے عبادت گاہوں میں تلاش کیا، میں نے تجھے ہر جگہ ڈھونڈا مگر تیرا پتہ نہ پایا، زاہدوں سے پوچھا تو انہوں نے رو کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا جب میں نے جہان رنگ و بو کے تمام تفکرات کو خیر باد کہا تو تجھے اپنے دل میں پایا۔

کشمیری زبان کی دوسری شہرۂ آفاق شاعرہ حبہ خاتون ہے۔ اصل نام زون تھا یعنی چاند وادی کشمیر کے گاؤں چندن ہار میں پیدا ہوئی۔ عبدی راتھر کی بیٹی نے فارسی کی ابتدائی تعلیم مکتب میں پائی۔ عزیز لون نامی بداخلاق اور ان پڑھ آدمی سے شادی کرائی گئی مگر للہ عارفہ کی طرح نباہ نہ ہوسکا۔ حبہ خاتون پیدائشی شاعرہ تھی۔ سوز و گداز موسیقیت اس کے خمیر میں تھی۔ وہ ایک دیہاتی لڑکی تھی مگر مہذب گھر کی بیٹی۔ یوسف شاہ چک اس پر اچانک عاشق ہو گیا اور وہ ملکہ

کشمیر بن کر شاہی محل میں پہنچ گئی، افسوس کہ ۱۵۸۶ء میں اکبر اعظم نے کشمیر پر قبضہ کیا تو کشمیر کے سلطان یوسف شاہ کو کشمیر بدر کر کے پٹنہ بہار میں نظر بند کر دیا۔ حبہ خاتون قصر شاہی سے نکل کر والدین کے گھر آ گئی جو وادی نیلم کے مقام گریس کے رہنے والے تھے۔ حبہ خاتون کی ساری فراقیہ شاعری اسی المیے کے نتیجے میں تخلیق ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وفات سرینگر میں ہوئی اور پانتہ چھک میں دفن کی گئی لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ وہ آخری دنوں میں اپنے شوہر کے پاس بسوک پٹنہ چلی گئی تھی اور وفات بھی وہیں ہوئی۔ حبہ خاتون نے کشمیر میں غزل کو روشناس کروایا، کشمیری میں ایرانی موسیقی کو متعارف کروایا، اس کے کلام میں بے ساختگی، سوز اور واقعیت پائی جاتی ہے۔ غزل کے علاوہ حبہ خاتون نے گیت بھی لکھے ہیں جو نا تمام حسرتوں کا آئینہ اور معصوم خواہشوں کا ایک قیمتی خزانہ ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ برصغیر کی میرابائی، ایران کی قرۃ العین طاہرہ اور کشمیر کی للہ عارفہ اور حبہ خاتون کو ایک جیسا ماحول ملا۔ یہ چاروں صدمات سے دوچار ہوئیں۔ چاروں نے ماحول کی کٹھن روایات اور رسوم کے خلاف آواز اٹھائی اور ذہنوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ان چاروں شاعرات کا کلام نہ صرف زندہ ہے بلکہ زندگی بخش بھی ہے۔ قرۃ العین نے کہا:

آزاد شود دہر ز اوہام و خرافات
آسودہ شود خلق ز تخییل توسوس

زمانہ اوہام خرافات سے آزاد ہو جائے گا
مخلوق خدا خیالوں اور وسوسوں سے نجات پائے گی

کشمیر میں عربی زبان کا فروغ

وادی کشمیر مختلف تہذیبوں، مذہبوں اور زبانوں کا مرکز رہی ہے۔ اسلام کے ورود سے قبل کشمیر نے پانچ سو سے زیادہ ایسے شعراء اور ادباء پیدا کیے جو سنسکرت میں اپنی یادگار تصانیف چھوڑ گئے۔ ان میں کلہن، بلہن کس میندر، بان کالی داس کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اسلام کے آنے کے بعد اس خطہ گل ولالہ میں فارسی وعربی کا چلن ہوا، اس کے ساتھ کشمیری زبان نے ارتقاء کی منزلیں طے کیں اور پھر اردو نے فروغ پایا۔

کشمیر میں علمائے دین کی کمی نہیں رہی۔ یہاں مدارس اور دارالکتب کا جال بچھا رہا۔ وادی کشمیر نے درجنوں علماء پیدا کیے جنہوں نے عربی زبان میں تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان میں حضرت سید علی ہمدانی، شیخ محمد یعقوب صرفی اور مولانا انور شاہ کشمیری کے نام سرفہرست ہیں۔ وادی کشمیر میں اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان کو فروغ سلطان شہاب الدین، سلطان قطب الدین اور سلطان زین العابدین کے عہد میں ہوا اور یہ عہد ۷۵۵ھ سے ۸۸۰ھ کو محیط ہے۔ سلطان زین العابدین نے جن کا لقب بڈھ شاہ ہے کشمیر میں یونیورسٹی قائم کی اور اس میں ایک عظیم الشان لائبریری کے علاوہ دارالترجمہ اور دارالتصنیف قائم کیا۔ بڈھ شاہ خود بھی کشمیری، بلتی، تبتی، عربی، فارسی اور سنسکرت جانتا تھا۔ متعدد کتابیں اس کے حکم سے سنسکرت سے عربی وفارسی میں منتقل ہوئیں۔ ''نزھتہ الخواطر'' کا مولف سلطان بڈھ شاہ کی تعریف میں لکھتا ہے کہ سلطان نے ارباب فضل وکمال کی ایک جماعت یکجا کردی تھی جنہوں نے ترجمہ کا کام کیا۔ فنقلوا کتباً کثیرہ من العربیہ وفارسیہ الی الھندیہ ومن الھندیہ الی العربیہ والفارسیہ۔ وادی کشمیر میں اسلام کی باقاعدہ اور منظم اشاعت اسلام کا کام سید علی ہمدانی (وفات ۷۸۶ھ) کے دور میں ہوا۔ آپ نے سرینگر میں ایک کتب خانہ قائم کیا۔ آپ ایک عظیم صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ عربی وفارسی کے زبردست مولف بھی تھے۔ آپ کی عربی تالیفات کی تعداد بیس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ان میں شرح اسماء

الحسنیٰ، المودۃ فی القربیٰ، رسالہ القدسیہ، روضۃ الفردوس، منازل السالکین، اربعین امیریہ قابل ذکر ہیں۔ سید علی ہمدانی کے فرزند سید محمد ہمدانی نے نجم الدین کاتبی کی تالیف ''اشمسیہ'' پر شرح لکھی تھی۔ نوربخشیہ فرقے کے بانی جناب سید محمد نوربخش نے فقہی احکام میں عربی میں ''فقہ احوط'' لکھی۔ حاجی محمد کشمیری (وفات ۱۰۰۴ھ) نے شمائل النبی کی شرح عربی میں لکھی جو بعد میں مصر میں طبع ہوئی۔ آپ نے شیخ صنعانی لاہوری کی تالیف ''مشارق الانوار'' پر شرح لکھی تھی۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیر کے چوٹی کے صوفیاء اور علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تالیفات کی تعداد بہت ہے۔ آپ فارسی کے شاعر بھی تھے۔ قرآن حکیم کی تفسیر مطلب الطالبین کے نام سے تحریر کی۔ شرح بخاری حاشیہ توضیح وتلویح قابل ذکر تالیفات ہیں۔ فیضی نے قرآن کی تفسیر صنعت مہملہ میں لکھ کر صرفی کو پیش کی تو صرفی نے اسی صنعت بے نقطہ میں ''سواطع الالہام'' کے نام سے مفصل مقدمہ لکھ کر مولف کو محوِ حیرت کر دیا تھا۔ یاد رہے کہ شیخ یعقوب صرفی حضرت مجدد الف ثانی کے استاد تھے۔ صرفی کے بیٹے ملا کبیر حسن نے ''شمائل ترمذی'' پر حواشی لکھے تھے۔ ان حواشی کا قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ایک اور کشمیری عالم دین ملا محمد محسن نے ''شرح عقائد'' پر عربی میں حواشی لکھے تھے۔ ان حواشی کا نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں موجود ہے۔

ملا محمد امین کشمیری نے ''شرح تہذیب'' پر عربی میں حاشیہ تحریر کیا۔ محمد محسن کشمیری نے علامہ سعد الدین تفتازانی کی تالیف ''المطول'' پر حواشی لکھے۔ ملا نور محمد کشمیری نے جو بارہویں صدی ہجری کے عالم تھے۔ ''شرح ملا جامی'' اور ''المطول'' پر عربی میں حواشی تحریر کیے۔ علامہ عبدالحکیم کشمیری ثم سیالکوٹی نے ''التلویح'' پر فصیح عربی میں حواشی لکھے۔ تیرہویں صدی ہجری کے ملا مصطفیٰ کشمیری نے ابن حاجب کے کافیہ کی شرح لکھی اور میر محی الدین نے ''میزان المقادیر'' تالیف کی۔ تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں مولانا محمد انور شاہ کاشمیری ضلع مظفر آباد کے گاؤں لوات میں پیدا ہوئے۔ آپ نہ صرف برصغیر بلکہ مصر و شام کے حلقہ علماء میں شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کشمیری، عربی، فارسی اور اردو کے ماہر تھے۔ آپ نے ایک فلسفی، عالم دین، صوفی اور شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ذہانت وفطانت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ علامہ اقبال جیسے عظیم فیلسوف نے حضرت کاشمیری سے استفادہ کیا تھا۔ مولانا انور شاہ کی چند عربی تصانیف کے نام اس

طرح ہیں۔ فصل الخطاب، عقیدۃ الاسلام، اکفار الملحدین، التصریح، نیل الفرقدین حزب الخاتم، العرف الشذی، فیض الباری یہ اور دیگر تالیفات طبع ہو کر بھارت، پاکستان اور دیار عرب میں مقبول ہو چکی ہیں۔ گو آج ریاست جموں وکشمیر کے مدارس میں فارسی اور عربی کا رواج کم ہو گیا ہے۔ تاہم خوشی کی بات یہ ہے کہ کشمیر کے مختلف علاقوں میں درس گاہیں موجود ہیں اور فارسی وعربی کی تالیفات کی سٹڈی کروائی جاتی ہے۔ آج کے جدید دور میں جدید علوم کی تدریس ہونے لگی ہے اور ایسے علوم پڑھائے جانے لگے ہیں جو آج کے سماج کو خوبصورت اور ترقی یافتہ بنا دیں۔ آج ہمیں درمع الدھر کیف دار کی ضرب المثل پر عمل کرنا ہوگا۔ مولانا حالی کی زبان میں چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

کشمیر میں اردو کی مزاحیہ شاعری

ریاست جموں وکشمیر میں چار بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کشمیری، پہاڑی، گوجری اور ڈوگری۔ پہاڑی میں تحریری ادب نہ ہونے کے برابر ہے لیکن دوسری تین زبانوں کی نظم ونثر میں بہترین مزاحیہ ادب ملتا ہے۔ اس خطے کی سرکاری اور کاروباری زبان اردو ہے۔ کشمیر کے اردو شاعروں میں مزاحیہ شاعری کرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن جتنی شاعری ملتی ہے وہ معیار اور کیفیت کے لحاظ سے ایسی ضرور ہے کہ پاکستان میں جن حضرات نے مزاح گو شاعروں کے تذکرے مرتب کیے ہیں کشمیر کے یہ شاعران تذکروں میں شامل کیے گئے ہیں۔ میں آج کی گفتگو میں کشمیر کے چند مزاح گو شاعروں کا تعارف اور ان کا مزاحیہ کلام پیش کروں گا۔ تقریر کی تیاری میں تاریخ تولد کے لحاظ سے ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ علامہ حسین میر کاشمیری معروف شاعر، صحافی اور بذلہ سنج تھے۔ آپ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی۔ امرتسر سے ہی ''ضیافت پنچ'' جاری کیا جو بڑا مزاحیہ ادب کا ترجمان تھا۔ پھر مولانا ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے اور لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ گزشتہ صدی کے پانچویں عشرے میں حکومت آزاد کشمیر کی طرف سے آپ پبلسٹی آفیسر تعینات ہو کر مظفرآباد آئے۔ اسی زمانے میں مرحوم سے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ علامہ صاحب قد کاٹھ، داڑھی اور رومی ٹوپی میں سرسید احمد خان کا مثنیٰ لگتے تھے۔ خوش گفتار بزرگ تھے اور جس محفل میں بیٹھتے اسے زعفران زار بنا دیتے۔ ان کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ آپ کو تحریف نگاری میں مہارت حاصل تھی۔ علامہ حسین میر کاشمیری کی مزاحیہ غزل کا نمونہ:

قیامت ہے کہ زور اشتہا کم ہوتا جاتا ہے
نظام جسم کم کھانے سے برہم ہوتا جاتا ہے
مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن!
نصیب احمقاں مرغ مسلم ہوتا جاتا ہے

مولانا چراغ حسن حسرت کٹھائی ضلع مظفرآباد میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ پونچھ شہر میں رہے یہاں سے کلکتہ چلے گئے اور مولانا آزاد کے ساتھ کام کرتے رہے جائیں۔ ۱۹۲۹ء میں اخبار ''زمیندار'' میں کام کرنا شروع کیا بعد میں لاہور ہی سے ایک فکاہی ہفت روزہ ''شیرازہ'' نکالنا شروع کیا۔ قیام پاکستان کے بعد روزنامہ ''امروز'' کے مدیر رہے۔ آپ کو فکاہی کالم نگاری کا بانی سمجھنا چاہیے۔ آپ کے کالم حرف وحکایت نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ حسرت کچھ عرصہ سید ضمیر جعفری کے ساتھ آرمی میں رہے اور برما اور سنگاپور میں قیام رہا۔ آپ اردو کے بہت بڑے صحافی، ادیب، کالم نگار اور شاعر تھے۔ کبھی کبھی مزاحیہ شاعری کرتے تھے۔ زیادہ کلام دستیاب نہیں ہے۔ آپ بیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۵ء کو لاہور میں وفات پائی۔ نظم میں مزاحیہ انداز ملاحظہ ہو۔ سنا ہے کیا کہا انگور نے آلو بخارا سے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا:

اٹھا کر پھینک دو اس کو
یہی کیلے کا چھلکا ہے

آزر عسکری ۱۹۱۱ء میں سکردو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر جموں میں گزاری۔ انقلاب کے بعد کوئٹہ، فیصل آباد اور راولپنڈی میں رہے۔ آخر عمر میں مظفرآباد آ گئے اور یہیں وفات پائی۔ ریاست کے بڑے مزاح گو تھے۔ اردو، پنجابی، کشمیری اور فارسی میں شاعری کرتے تھے ''مجموعہ کشت زعفران'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مجھے مرحوم کی صحبتیں میسر رہی ہیں میں نے اپنی نگرانی میں پروفیسر راجہ رحمت سے آزر عسکری پر ایم فل کروایا ہے۔ ان کا بیٹا ابراہیم گل بھی مزاح گو ہے۔ ان کی ایک مزاحیہ نظم سماعت فرمایئے:

کسی کے تلووں میں چبھ رہے ہیں نو کیلے پتھر تو کیا کریں ہم
کسی کو بخشی گئی ہے دس ہاتھ لمبی موٹر تو کیا کریں ہم
کسی کی قسمت میں ٹھوکریں ہیں کوئی منسٹر تو کیا کریں ہم
اجارہ داری کسی کو حاصل کوئی بچارا خدا کی مرضی

یہ گفتگو اس گفتگو کا تسلسل ہے جو ہم کشمیر میں اردو کی مزاحیہ شاعری کے عنوان سے پہلے کر چکے ہیں۔ بلبل کاشمیری کا نام شیخ غلام علی تھا ۱۹۳۲ء میں بانڈی پور کشمیر میں متولد ہوئے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہجرت کر کے راولپنڈی آ گئے۔ بعد میں لندن چلے گئے اور ۱۹۹۸ء میں فوت ہوئے۔ فوج میں ملازمت کے دوران سید ضمیر جعفری سے آشنائی ہوئی جو دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ معروف مزاح گو تھے۔ کلام کا مجموعہ ''خندہ گل'' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔

بلبل کاشمیری کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں عنوان ہے ''انگلستان میں عید'':

یہاں آ کر بھی ہم نے مانگنے کی خو نہیں بدلی
یہاں آ کر بھی ہم نے دیس کے دھندے نہیں چھوڑے
یہاں کی عید بھی تو دیس کی ہی عید جیسی ہے
یہاں آ کر بھی ہم نے عید کے چندے نہیں چھوڑے

اور اب قصیدہ در مدح خود ہا میں ۱۹۳۳ء میں ضلع مظفر آباد میں پیدا ہوا۔ تین زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں ایران سے فارسی ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اردو، فارسی اور گوجری کی سنجیدہ شاعری کے پندرہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ میری مطبوعہ تصانیف کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ مزاحیہ شاعری میں جناب ضمیر جعفری کا مداح ہوں۔

میری مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ''خندہائے بے جا'' ۱۹۹۴ء میں طبع ہوا میرے یہ قطعات سنئے:

زمانہ ایک روش پر سدا نہیں چلتا!
بدلنا ہو گا یہ مصرع نئے بیاں کے لیے
نگاہ پست سخن دل خراش جاں بے سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

مجھ کو تو عشق و شق کا کچھ عارضہ نہیں
میں ان مصیبتوں میں پریشاں نہیں رہا
بجلی کا بل میں جمع کرانے گیا تھا کل
پھر اس کے بعد مرا گریباں نہیں رہا

وادی کشمیر کے نامور مزاح گو قاضی غلام محمد ۱۹۳۶ء میں اننت ناگ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی پھر کشمیر یونیورسٹی سرینگر میں ریاضیات کے پروفیسر مقرر

ہوئے۔طربیہ کلام میں نظمیں، غزلیں اور پیروڈیاں شامل ہیں۔شگفتہ کلام کا مجموعہ ''حرف شیریں'' ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد دکن میں شائع ہوا ہے۔اب قاضی غلام محمد کے مزاحیہ کلام کا نمونہ پیش ہے جو ایک پیروڈی ہے:

ڈر یہ نہیں کہ ہجر میں جینا محال ہے
ڈر ہے کہ خاکسار کثیرالعیال ہے
کتوں کا اک ہجوم جلو میں ہے رات دن
پتلا دیار حسن میں عاشق کا حال ہے

ڈاکٹر عبدالرحمن عبد کا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے ہے۔آپ ۱۹۴۴ء میں اسی شہر میں پیدا ہوئے۔طب میں اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے امریکہ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔''عرفان عبد'' کے نام سے ڈاکٹر صاحب کی سنجیدہ شاعری کا مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔طنز و مزاح میں بھی نام پیدا کیا۔ڈاکٹر عبدالرحمن عبد کی مزاحیہ غزل کے یہ دو اشعار سنئے:

پہلے آتے تھے یہاں کچھ پا پیادہ دیر سے
اب سبھی آنے لگے ہیں بااراده دیر سے
آج امریکہ میں بھی ہم نے مروج کر لیا
جو وطن میں عام تھا دستور سا وہ دیر سے

آزاد کشمیر کے اکثر اردو شعراء کے کلام میں مزاحیہ اشعار مل جاتے ہیں مگر وہ سنجیدہ گوئی کے حوالے سے ہی مشہور ہیں۔مظفرآباد کے سید غلام حسن شاہ بیتاب ایڈووکیٹ مرحوم بہت اچھی مزاحیہ شاعری کرتے تھے لیکن مجھے ان کا کلام نہیں مل سکا اس لیے نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔خواتین میں ایک نووارد شاعرہ شاہینہ خان کا نام ایک تذکرے میں ملتا ہے لیکن کوائف نہیں دیئے گئے۔یہ دو شعر پیش ہیں:

چار دن کی زندگی ہے خوب کر لے عیش تو
مال ہے شوہر کا تو کیسا خسارہ دیکھنا
سوٹ میں نے دیکھا ہے کل ایک خالص سلک کا
تم ذرا اس شاپ پر جا کر غرارہ دیکھنا

کشمیر کے فارسی مورخین

سرزمین کشمیر میں تاریخ نویسی کی روایت نہایت قدیم ہے۔ دور اسلام سے پہلے کشمیر کے پنڈتوں نے سنسکرت میں نظم ونثر میں تاریخ لکھی۔ خاص طور سے ''راج ترنگنی'' قابل ذکر ہے جو ۱۱۴۹ء میں نظم کی گئی۔ پنڈت کلہن نے ''راج ترنگنی'' آٹھ ترنگوں میں قلم بند کی جس میں کوئی چار ہزار سال کی تاریخ ملتی ہے۔ اکبر بادشاہ نے جب کشمیر پر قبضہ کر کے وہاں کا سفر کیا تو ملا شاہ محمد شاہ آبادی کے ذریعے سنسکرت سے فارسی نثر میں اس کتاب کا ترجمہ کروایا۔ یہ فارسی ترجمہ میں نے ۱۹۷۲ء میں ایڈٹ کیا جو مدت ہوئی شائع ہو چکا ہے۔ ''راج ترنگنی'' برصغیر میں تاریخ کی اولین کتاب ہے۔

کشمیر کی وادیاں جب آفتاب اسلام سے تابناک ہوئیں تو درجنوں اہل قلم نے فارسی میں تاریخ نویسی کی روایت کی بنیاد ڈالی۔ افسوس کہ آج بہت ساری ایسی کتب تواریخ کا سراغ نہیں ملتا۔ ملا احمد کی ''وقائع کشمیر'' ملا نادری کی ''تاریخ کشمیر'' قاضی حمید کی ''تاریخ کشمیر'' ملا حسین قادری کی ''تاریخ کشمیر'' کا نام لیا جا سکتا ہے جن کا فقط نام ہی رہ گیا ہے۔

مسلمانوں اور سکھوں کے عہد حکومت میں بھی تواریخ لکھی گئیں جو شہرت نہ پا سکیں مثلاً ''تاریخ التنویر''، ''تاریخ کبیر''، ''مراۃ الاولیاء'' اور ''عمدۃ التواریخ'' وغیرہ جن کتب تواریخ کے قلمی اور مطبوعہ نسخے دستیاب ہیں ان کا مختصر تعارف اس طرح ہے۔ اس تعارف میں ترتیب زمانی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

تاریخ رشیدی ۹۵۱ھ

اس کا مصنف مرزا محمد حیدر دغلت ہے۔ جو بابر کی خالہ نگار خاتون کا بیٹا تھا اور اس کا باپ شاہی بیگ خان تھا۔ دغلت نے کشمیر کو ۹۳۹ھ میں فتح کیا۔ یہ کتاب خوانین مغولستان کی تاریخ ہے لیکن اس میں کشمیر کے واقعات بھی ملتے ہیں۔ کتاب کے دفتر اول میں تیمور سے عبدالرشید خان تک کے حالات ہیں۔ دفتر دوم میں ازبک، چغتائی اور شہزادوں کے حالات درج ہیں۔

تاریخ حیدر ملک چاڈورہ ۱۰۳۰ھ

حیدر ملک کشمیر کے پرگنہ ناگام کا باشندہ تھا۔ اس کی ''تاریخ کشمیر'' اہم کتاب ہے۔ یہ ۱۰۳۰ھ میں مکمل ہوئی۔ شجاعت اور وفاداری کے صلہ میں جہانگیر نے حیدر ملک کو چغتائی کا لقب دیا تھا۔ یہ تاریخ ہندو اساطیر کے مطابق ستی سر کے واقعہ سے شروع ہوتی ہے۔ کتاب جہانگیر سے معنون ہے۔ پہلی قسمت میں راجہ ہائے کشمیر کا ذکر ہے اور دوسرے حصے میں ان خاندان کا ذکر ملتا ہے جو ایران اور ترکستان پر حکومت کرتے رہے۔

بہارستان شاہی تالیف ۱۰۳۵ھ

یہ مفصل تاریخ ہے مولف کا نام کسی جگہ نہیں آیا مگر اکثر تاریخ نویسوں کی رائے یہ ہے کہ اس کے مولف کا نام سید مہدی کشمیری تھا۔ مولف نور بخشیہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس تاریخ کا ماخذ راج ترنگنی ہے۔

تاریخ ہادی ۱۱۰۸ھ

مولف احمد بن صبور کشمیری ہے جو خواجہ محمد ہاشم کشمیری کا مرید تھا۔ کتاب کا دوسرا نام خوارق السالکین بھی ہے۔ مولف اپنے عہد کا نامور عالم اور صوفی تھا۔

تاریخ کشمیر ۱۱۲۲ھ

مولف نرائن کول عاجز ہے۔ یہ کتاب عالمگیر کے آخری عہد میں لکھی گئی۔ تاریخی واقعات کو ناقص انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ عبارت مرصع اور مشکل ہے۔

تاریخ کشمیر ۱۱۲۹ھ

مولف حسن ابن علی کشمیری ہے۔ اس کا ماخذ بھی راج ترنگنی ہے۔ وادی کشمیر کے خشک ہونے کی روایت ستی سر سے شروع ہو کر ۱۱۲۹ھ کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔

نوادر الاخبار ۱۱۳۶ھ

اس کا مولف رفیع الدین غافل ہے۔ اس تاریخ میں تمام تاریخی مباحث مثلاً داستان سلیمان، مسلم سلاطین، فتح اکبر وغیرہ ملتے ہیں۔

تاریخ اعظمی ۱۱۶۰ھ

کتاب کا مولف خواجہ محمد اعظم دیدہ مری ہے۔ وہ ۱۱۰۳ھ میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں محمد رضا مشتاق کا شاگرد تھا۔ مجددی نقش بندی سلسلہ سے منسلک تھا۔ اکابر مشائخ کشمیر میں شمار ہوتا ہے۔ آٹھ کتابوں کا مولف ہے تاریخ اعظمی کے تین حصے ہیں۔

بیان واقعہ، ۱۱۶۶ھ

کتاب کا مولف ملا عبدالکریم کشمیر میں پیدا ہوا اور ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ حج کرنے کا بہت شوق تھا جب نادر شاہ افشار نے دہلی پر حملہ کیا تو ملا عبدالکریم دہلی میں ہی رہتا تھا اس لیے حج پر نہ جا سکا لیکن نادر شاہ ملا عبدالکریم کی ذہانت سے متاثر ہوا اور ۱۱۵۱ھ میں اسے ملازمان دربار میں شامل کر لیا۔ بعد میں وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔ ایک بار اسے روس اور ترکی قائد وفد بنا کر بھیجا گیا۔ بیان واقعہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔

شاہنامہ کشمیر ۱۱۷۴ھ

راجہ سکھ جیون مل کی منظوم تاریخ ہے۔ وہ آٹھ سال تک کشمیر کا گورنر رہا۔ سکھ جیون ماہر لسانیات، عالم، سیاستدان اور شاعر تھا۔ اس نے کشمیری شاعروں کا ایک بورڈ قائم کیا جس نے تاریخ کشمیر قلم بند کی۔

باغ سلیمان ۱۱۹۴ھ

میر سعد اللہ شاہ آبادی کی تالیف ہے۔ میر سعد اللہ عالم دین اور شاعر تھا۔ باغ سلیمان کشمیر کی منظوم سیاسی تاریخ ہے۔

گوہر نامہ عالم ۱۱۸۸ھ

بدیع الدین ابوالقاسم منعمی خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کا بیٹا تھا۔ یہ کشمیر کی مفصل ترین فارسی تاریخ ہے۔ چھ طبقات پر مشتمل ہے۔ شاہ مری چک تیموری افغان بادشاہوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس میں کشمیر کے شہروں اور عبادت گاہوں کی تفصیل ملتی ہے۔

تاریخ ہدایت اللہ ۱۲۰۶ھ

یہ ہدایت اللہ متو کی تالیف ہے۔ ہدایت اللہ اپنے عہد کا زبردست عالم اور صاحب قلم تھا یہ تاریخ اعظمی کی واقعات کشمیر کا تکملہ ہے۔ بزرگان دین اور صوفیاء کے حالات بھی ملتے ہیں۔

حشمت کشمیر ۱۲۴۵ھ

اس کا مولف عبدالقادر بن قاضی القفاۃ مولوی واصل علی خاں ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۲۱۳ھ میں ایک شخص رحم علی کو مامور کیا تھا کہ وہ کابل سے دہلی تک کا سفر کر کے منازل کا تعین کرے چنانچہ رحم علی نے یہ مسافت طے کر کے یادداشت تیار کی۔ عبدالقادر نے ان یادداشتوں کو دوبارہ مرتب کیا۔ کتاب کے چار چمن ہیں:

چمن اول میں عجائبات کشمیر اور مصنوعات کشمیر کا ذکر ہے۔

چمن دوم میں احوال تبت اور مانی کی نقاشی کا بیان ہے۔

چمن سوم: احوال بدخشاں۔

چمن چہارم: کوہستان، افغانستان، غور، غزنی، کوہ سلیمان۔

کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

گلزار کشمیر ۱۲۴۹ھ

دیوان کرپارام کشمیر کا وزیر اعظم رہا، علم وادب کے فروغ، شفاخانوں کی تعمیر، شاہراہوں کی مرمت اور مالیات کی اصلاح اس کے چند کارنامے ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے دارالترجمہ قائم کیا تھا جس میں دیوان کرپارام بھی کام کرتا رہا۔ کرپارام کئی کتابوں کا مولف ہے۔ اس کی ایک اہم تالیف گلاب نامہ بھی ہے۔

اکبر نامہ ۱۲۶۰ھ

افغانیوں نے ۱۸۵۴ء سے ۱۸۱۹ء تک کشمیر پر حکومت کی۔ رنجیت سنگھ نے ان سے اقتدار چھینا تھا۔ والئی کابل سردار محمد اکبر خاں نے سکھوں کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ فردوسی کشمیر ملا حمید اللہ شاہ آبادی نے اس جنگ کے واقعات کو نظم کیا۔ ملا حمید اللہ کا یہ شاہنامہ کابل میں شائع ہوا۔

مجموع التواریخ ۱۲۶۳ھ

بیربل وارستہ اس کا مولف ہے۔ وہ ایک کامیاب مترجم اور شاعر تھا۔ اس تاریخ میں سکھوں کے عہد کے سیاسی واقتصادی حالات ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ کتاب کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔ تاریخ حسن تالیف ۱۳۰۵ھ غلام حسن کھوئی ہامی عالم وشاعر تھا۔ وہ پنجاب اور افغانستان میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ تاریخ حسن چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ سیاسی اور تمدنی حالات کے علاوہ کشمیر کے شاعروں اور علماء کے حالات درج ہوئے ہیں۔ تحائف الابرار تالیف ۱۳۲۱ھ ایک مستند تاریخ ہے۔ مولف حاجی محمد مسکین ہے۔ کتاب کا دوسرا نام تاریخ کبیر جی ہے اور ۱۹۰۶ء میں امرتسر میں طبع ہوئی۔ ۹۵۱ھ سے لے کر ۱۳۰۵ھ تک تین سو پچاس کا عرصہ بنتا ہے جس میں بے شمار کتب تواریخ فارسی میں توید ہوئیں۔ ہم نے خوف طوالت سے صرف سترہ اہم کتابوں کا تعارف کرایا ہے۔ جن کے قلمی اور مطبوع نسخے یورپ اور ایشیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ یہ کتابیں کشمیریات پر مستند ترین ریکارڈ کا درجہ رکھتی ہیں۔

تاریخ نویسی اور مطالعہ تاریخ کی اہمیت علامہ اقبال نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

حفظ کن تاریخ را پائندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

البیرونی اور کشمیر

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (وفات ۴۴۰ھ) شہرۂ آفاق فیلسوف، مورخ، طبیب اور منجم ہو گزرا ہے۔ ہیئت، ہندسہ اور جغرافیہ میں بھی وہ یدطولیٰ رکھتا تھا۔ البیرونی نے ابتدائی تعلیم اپنی زادگاہ خوارزم میں حاصل کی۔ جب ۴۰۴ھ میں محمود غزنوی نے خوارزم شاہ کو قتل کر کے اس ملک کو فتح کیا تو البیرونی ۴۰۸ھ میں غزنی چلا گیا۔ وہاں اس نے رصدگاہ تعمیر کروائی۔ جب غزنوی نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو البیرونی بھی اس کے ہمراہ رہا۔ قدیم ہند کی تصانیف و تاریخ اور آداب و رسوم کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ''ماہند'' جیسی اہم کتاب تالیف کی۔ اس کا سال تالیف ۴۲۳ھ ہے اور اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ البیرونی نے پنڈ دادن خان کے قریب نندانہ میں بیٹھ کر زمین کا قطر معلوم کیا۔ کچھ عرصہ وہ ملتان اور قنوج میں مقیم رہا۔ اس نابغہ روزگار محقق نے سنسکرت سیکھی اور ویدوں کے علاوہ بھگوت، گیتا، رامائن اور مہابھارت کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔ ابوریحان البیرونی نے اس دوران کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کشمیری پنڈتوں سے خط و کتابت بھی کرتا رہا۔ ممکن ہے وہ بذات خود کشمیر گیا ہو مالللہند کا خاصہ حصہ سرزمین کشمیر کے بارے میں جغرافیائی، تاریخی اور مذہبی معلومات پر مشتمل ہے اور یہاں کے دریاؤں اور ندیوں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ البیرونی باشندگان کشمیر کے بارے میں لکھتا ہے۔

''وہ خاص طور سے اپنے ملک کی ترقی توانائی کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں اس مقصد کے لیے وہ کشمیر میں آنے والے راستوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔'' البیرونی نے کشمیر کے جن مقامات کا ذکر کیا ہے ان میں لوہر کوٹ، راج گیری، بھوتیشر، کوٹیہار اور شاردا قابل ذکر ہیں۔

لوہر کوٹ کا قلعہ پونچھ میں تتہ کوٹی اور تومہ میدان کے درمیان تھا۔ یاد رہے کہ لوہر گوجر خاندان کی ایک گوت ہے جو لوسر لہاور اور لہور کے نام سے بھی موسوم ہے۔ لوسر شرفو، لوہرٹوپہ، لوہرین اور لوہر کوٹ اور شہر لاہور اس گوٹ کے نام سے منسوب ہے۔

راج گیری کا قلعہ لوہرن کے جنوب میں تتہ کوٹی کے پہاڑ کے دامن میں بنایا گیا تھا۔اس کا موجودہ نام لوہر ہے۔ بھوتیش کا مندر کشمیر کے کوہ ہرمکھ کے دامن میں واقع تھا۔البیرونی نے اس کے ساتھ ساتھ سرینگر شہر پر بھی کافی مواد پیش کیا ہے۔البیرونی تحریر کرتا ہے کہ کشمیر میں جو حروف تہجی مروج تھے ان کا نام سدمتریک تھا، البیرونی نے پرگنہ کوٹیہار میں پاپ سودن کے حوض کا بھی ذکر کیا ہے جو ۱۰۶۳ھ میں تعمیر کرایا گیا تھا۔

کتاب ''ماللہند'' میں شاردا کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ ضلع اٹھمقام میں وادی نیلم کا ایک گاؤں شاردا کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں مشہور مندر تھا۔البیرونی لکھتا ہے سرینگر سے دو یا تین روز کی مسافت پر کوہستان بلور کی سمت ایک مندر جسے شاردا کہا جاتا ہے۔

میری تحقیق یہ ہے کہ یہاں ایک یونیورسٹی بھی تھی جہاں دور دور سے طلبہ آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔شاردا رسم الخط اسی جگہ ایجاد ہوا۔راج ترنگنی کا مترجم ایم۔اے سٹائن تحریر کرتا ہے کہ جینی مذہب کے عالم ھیم چندر نے یہاں سنسکرت کی نئی گرائمر مرتب کی جس کا نام سدھا ھیم چندر مشہور ہوا۔ابوریحان البیرونی نے صوبہ سرحد کو کشمیر سے ملانے والے راستوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ''مالہند'' کے مطابق کشمیر جانے والا راستہ برہان (اٹک) سے شروع ہوتا تھا۔دھم توڑ، بیرن گلی اور پٹن سے ہوتا ہوا موجودہ داڑہ ضلع مظفر آباد تک پہنچتا تھا۔ جہاں کشتاری (دریائے کنہار) کا پانی دریائے مدھومتی یعنی نیلم میں گرتا ہے اور یہاں ایک پل ہوتا تھا۔

معروف مولف ڈی بوئر کے بقول کشمیری پنڈتوں نے البیرونی کو دس سوالات بھیجے تھے جس کا جواب البیرونی نے الجوابات من المائل العشر الکشمیر کے نام سے دیا تھا۔

اس مختصر سی گفتگو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابوریحان البیرونی نے کشمیر کی تاریخ جغرافیہ اور ثقافت کا مطالعہ کیا اور اپنے اس مطالعہ کے نتائج اپنی عربی تالیف ''مالہند'' میں قلم بند کر دیئے جو قدیم برصغیر کی تہذیب وتمدن پر دائرہ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے اردو اخبارات

ریاست جموں وکشمیر پر ڈوگرہ دور اقتدار غلامی کا بدترین دور رہا ہے۔ اس دور میں کوئی آدمی ڈوگروں کے خلاف کوئی بات نہ کر سکتا تھا اور نہ لکھ سکتا تھا۔ عوام مظالم برداشت کرتے مگر آواز حق بلند نہ کر سکتے تھے۔ ریاست میں کوئی پریس اور کوئی اخبار نہ تھا، یہ ۱۹۲۴ء کا سال تھا جب ملک راج صراف نے جموں سے ہفت روزہ ''رنبیر'' نکالنا شروع کیا جو سیالکوٹ میں چھپتا اور جموں سے تقسیم ہوتا تھا۔ یہ ریاست جموں وکشمیر کا پہلا اخبار ہے۔ اس کے بعد آغا بشیر احمد نے جموں سے ہی ماہنامہ ''رفیق'' کا اجراء کیا۔ ۱۹۳۲ء میں پریس کو محدود آزادی ملی تو منشی معراج دین احمد نے جموں سے پہلا مسلم اخبار پاسبان جاری کیا۔ ۱۹۳۱ء میں کشمیر میں تحریک آزادی شروع ہوئی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں پریس کو مزید آزادی دی گئی اور ۱۹۴۳ء میں ریاست میں تین پرائیویٹ اور دو سرکاری پریس قائم ہوئے، اب یہاں کتابیں چھپنا شروع ہوئیں۔ ۱۹۴۴ء کے زمانے میں ریاست میں ۶۳ اخبار نکلتے تھے جن میں پچاس اخبار اردو کے تھے لیکن یہ سارے اخبار ہفت روزہ تھے۔ ان میں صرف ہمدرد روزانہ تھا جس کے مدیر پریم ناتھ بزاز تھے۔ جموں سے معروف صحافی عبدالمجید قریشی ''جمہور'' نکالتے تھے۔ پونچھ شہر سے حکیم سعید الدین اور خواجہ غلام محی الدین نے ''اتحاد'' کے نام سے ہفت روزہ نکالا جو بعد میں جلد ہی بند کر دیا گیا۔ شیخ نبی بخش نظامی نے الجاھد جاری کیا جسے حکومت نے زیادہ دیر نہ چلنے دیا۔ سرینگر سے روزنامہ ''خدمت'' جاری ہوا جس کے مدیر وادی نیلم کے مولانا محمد سعید مسعودی تھے۔ جموں سے غلام حیدر غوری نے نوجوان اور نامور سیاسی رہنما اور خطیب اے۔ آر ساغر نے جاوید جاری کیا۔ نرسنگ داس نرگس کا چاند کئی برسوں تک آسمان صحافت میں چاندنی بکھیرتا رہا۔ سرینگر سے میر عبدالعزیز نے ملت جموں سے آغا قیس شروانی نے خورشید اور فردوس جاری کیے۔ چراغ حسن حسرت کے بھائی ضیا الحسن ضیاء نے صادق گلزار احمد فدا نے پریم اور سرینگر سے کشمیر کے عظیم عالم دین اور سیاسی رہنما مولوی محمد عبداللہ ایڈووکیٹ کے فرزند جناب ایوب صابر نے ''البرق'' کے نام سے ہفت روزہ جاری کیا۔

جموں، سرینگر اور پونچھ کے بعد مظفرآباد چوتھا شہر ہے جہاں سے منشی عبدالعزیز چکاروی نے ۱۹۳۵ء میں ہفت روزہ ''زمیندار آرگن'' چھاپنا شروع کیا۔ ۱۹۴۰ء میں سید اکبر علی شاہ کی

نگرانی میں ''انوارالسادات'' شائع ہونا شروع ہوا۔ یاد رہے کہ منشی عبدالعزیز نے مظفرآباد میں چھوٹا سا پریس لگوالیا تھا۔ آزادی کے بعد پریس کو آزادی ملی تو ہفت روزہ اخبارات کا ایک سیل آ گیا۔ مظفرآباد، میرپور اور پاکستان کے شہروں راولپنڈی، لاہور اور سیالکوٹ سے درجنوں اخبار شائع ہونے لگے۔ کچھ ایک تو پاکستان میں چھپتے اور وہیں سے تقسیم ہوتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں ملک فضل کریم برنالوی نے بھمبر سے ہفت روزہ ''تنظیم'' جاری کیا۔ اس اخبار نے میرپور کے عوام کو زمین کے حقوق ملکیت دلانے کے لیے موثر جدوجہد کی۔ محمد فیاض عباسی نے ''پاک کشمیر'' نکالا۔ ایک سال بعد یعنی ۱۹۵۲ء میں بشیر احمد قادری نے ''پنڈی میل'' ضیاالحسن ضیاء نے میرپور سے صادق کاڈکلیریشن حاصل کیا۔ سیالکوٹ سے عبدالمجید قریشی نے ''ترجمان کشمیر'' راولپنڈی سے میر عبدالعزیز نے ''آوازحق'' سیالکوٹ سے چوہدری نذیر احمد نے ''آزادوطن'' نکالنا شروع کیا۔

معروف صحافی اور دانشور عبدالقیوم درانی کی تحقیق کے مطابق ۱۹۶۳ء کے بعد جو اخبارات جاری ہوئے ان کی تفصیل یوں ہے۔

۱۹۶۳ء میں جہان نو نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس کے مدیر محمد اقبال بلتی تھے بعد میں اس کے مدیر عبدالغنی غنی اور قیوم درانی رہے۔ ۱۹۴۹ء میں ریاست جموں وکشمیر کے عظیم صحافی اور سیاسی رہنما جناب خواجہ عبدالصمد وانی نے راولپنڈی سے ''کشمیر'' کی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ اخبار آج بھی نکل رہا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جی۔ ایم مفتی نے ''قائد'' وحید چراغ نے ''کارزار'' کا آغاز کیا، سرشار اختر ملک کا ہفت روزہ ''چنار'' خواجہ عبدالرشید کا ''ملت''، ظہیرالحسن جاوید کا ''شیرازہ'' نورالدین اختر کا ''انقلاب'' عبدالحفیظ سالب کا ''آغاز''، شبیر شاہ کا ''قیادت''، حمید مفتی کا ''انجام'' غلام احمد ترالی کا ''مضراب''۔ محمد خان نشتر کا ''شعور'' آزر عسکری کا ''مشیر'' ایم ڈی چوہدری کا ''پاک کشمیر'' محمد زبیر زخمی کا ''جمیل''، مولانا عبدالباری کا ''بے باک''، شیخ عطاء اللہ کا ''شعلہ'' اے آرزار بٹ کا ''مبصر'' محمد اقبال ترانہ آزاد کشمیر کے ممتاز ہفت وار اخبارات میں شمار ہوتا ہے۔ ان اخبارات نے ملت کی بڑی خدمت کی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں روزنامہ سیاست اور ۱۹۹۷ء میں روزنامہ محاسب کا اجراء مظفرآباد میں لایا گیا۔ اس سے پہلے روزنامہ ''آزادی'' کچھ عرصہ چل کر بند ہو گیا تھا۔ سال رواں کے آغاز میں ایک بھرپور مکمل اور معیاری روزنامہ جموں وکشمیر نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ یہ اخبار آزاد کشمیر میں مقبول ہو چکا ہے اور اس کا مستقبل تابناک دکھائی دیتا ہے۔

کشمیر کی لائبریریاں

کشمیر کے عظیم مورخ صاحب زادہ حسن شاہ اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ کشمیر میں سب سے پہلا کتاب خانہ سلطان زین العابدین نے قائم کیا اور اس میں برصغیر کے علاوہ خراسان، ایران، شام اور عرب سے کتابیں منگوا کر رکھیں۔ یہاں تک کہ گورنر مکہ نے تفسیر کشاف کا ایک نسخہ لائبریری کے لیے بطور تحفہ بھجوایا۔ سلطان بڈھ شاہ کی اس لائبریری میں جلد بندی، خطاطی، نساجی، حکاکی اور تذہیب کاری کی تربیت دی جاتی تھی۔ روس کے معروف کتاب شناس پروفیسر ایوانوف نے لکھا ہے کہ آج بھی مرکزی ایشیا اور ایران کے کتب خانوں میں جو مخطوطات پائے جاتے ہیں ان میں کشمیری کتابوں کے تیار کردہ نسخے بکثرت ملتے ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دوران میں دیوان کرپارام وزیر اعظم بنا۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کا عالم تھا اس نے ایک بڑا کتاب خانہ ''سری رنبیر سارسوت'' کے نام سے قائم کیا۔ جموں میں بھی شاہی کتاب خانہ قائم ہوا۔

سری رنبیر سنگھ لائبریری میں ادب، تاریخ، فلسفہ، سفرنامہ، لغت، اقتصادیات اور مذہب پر مشتمل کتابیں موجود ہیں اور کتابوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ ریاست کشمیر کا دوسرا بڑا کتاب خانہ ۱۸۹۲ء میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں قائم ہوا تھا۔ لائبریری کے ایک حصہ میں آثار قدیمہ کا عجائب گھر ہے اور اس میں مخطوطات، قدیم سکوں اور کشمیر صنعت و معدنیات کے نمونے ملتے ہیں۔ اس لائبریری میں فارسی، عربی اور اردو کی کتابیں زیادہ ہیں۔ کشمیری اور پنجابی کے شعبے گزشتہ صدی کے اواخر میں قائم کیے گئے۔ اس لائبریری میں کتابوں کی تعداد اسی ہزار کے قریب ہے۔

ریاست کشمیر کی ایک بڑی لائبریری پونچھ کے راجہ جگدیو سنگھ نے ۱۹۲۰ء میں قائم کی تھی۔ افسوس کہ ۱۹۴۷ء میں بھارتی قبضے کے دوران کتاب خانے کا نقصان ہوا مگر سنا ہے اب اسے بہتر بنا دیا گیا ہے۔ اس میں انگریزی کے علاوہ اردو، فارسی اور پنجابی کے شعبے بھی ہیں۔ کشمیر میں ۱۹۵۶ء میں

ضلعی سطح پر کتاب خانے قائم کیے گئے، چنانچہ اننت ناگ، بارہ مولہ اور کھٹوعہ میں پبلک لائبریریاں بنائی گئیں۔ یہ ڈسٹرکٹ لائبریریاں باقاعدہ نظام کے تحت کام کرتی ہیں اور ان کو سالانہ سرکاری گرانٹ ملتی ہے۔اس کے علاوہ محکمہ دیہات سدھار کے تحت ہر تحصیل میں ایک لائبریری قائم ہے۔

سرینگر میں یونیورسٹی لائبریری ۱۹۴۹ء میں قائم کی گئی اور یہ حضرت بل کے سامنے یونیورسٹی کی عمارت میں ہے۔اسے سرکاری گرانٹ ملتی ہے اور بیرونی ممالک سے بطور تحفہ بھی کتابیں آتی ہیں۔تعداد کتب ڈھائی لاکھ سے اوپر ہے۔یورپی زبانوں کے شعبوں کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی، عربی، ہندی، پنجابی اور ڈوگری زبانوں کے شعبے ہیں۔ یہ ریاست کی سب سے بڑی اور جدید لائبریری ہے۔اورنٹیئل ریسرچ لائبریری کا قیام ۱۹۰۵ء میں کیا گیا۔ ۱۹۳۵ میں اردو، فارسی اور عربی کے شعبے قائم ہوئے، پالی مخطوطات کا ڈیڑھ ہزار سالہ ریکارڈ بھوج پتر پر تحریر ہے۔۱۹۵۱ء میں اسی لائبریری میں فقہ، حدیث، تفسیر ادبیات عربی و فارسی، اسلامی تاریخ اردو ادب اور علاقائی زبانوں کے شعبے قائم ہوئے۔قلمی کتابوں کے شعبے میں ۲۵۰ سنسکرت اور سترہ عربی و فارسی کے قلمی نسخے ملتے ہیں۔مجموعی تعداد تین ہزار تک ہے نیز چار سو کشمیری تصانیف کی مائیکروفلم نقول موجود ہیں۔ترجمہ ونقل کی سہولت مفت دی جاتی ہے۔یونیورسٹی لائبریری میں خطاطی اور مصوری کے پانچ سو نمونے رکھے گئے ہیں، اس کے علاوہ تبتی چوبی بلاک کی مطبوعات کا ایک عمدہ مجموعہ موجود ہے، کشمیر کی تاریخ اور تہذیب پر کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم مرکز ہے۔سرینگر میں ایک قابل ذکر لائبریری کشمیر اکیڈمی کی بھی ہے، ۱۹۵۷ء میں کشمیر کی علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے اکیڈمی آف آرٹ اینڈ کلچر کا قیام عمل میں لایا گیا۔مرزا کمال الدین شیدا اس کے معتمد مقرر ہوئے، اکیڈمی کے ایک حصے میں قلمی نسخے اور دوسرے میں ادبیات وفنون کی کتابیں ہیں۔

رگھوناتھ مندر لائبریری اورنٹیئل کالج جموں میں قائم ہے۔یہ قدیم لائبریری ہے اور اس کی فہرست ''راج ترنگنی'' کے انگریزی مترجم ایم۔اے سٹائن نے ۱۸۹۸ء میں مرتب کی ۔تھی محکمہ اوقاف نے سرینگر میں ایک کتاب خانہ مدینۃ العلوم میں قائم کیا۔اس کتاب خانے میں دوسو کے قریب مخطوطے اور دس ہزار کتابیں بتائی جاتی ہیں۔یہاں دارالمصنفین اعظم گڑھ، دائرۃ المعارف حیدرآباد، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور دارالعلوم دیوبند کی مطبوعات جمع کردی گئی ہیں، آئندہ گفتگو میں ہم مزید لائبریریوں کا ذکر کریں گے۔

آزاد کشمیر کی لائبریریاں۔ ۲

ریاست جموں و کشمیر کی اہم سرکاری اور نیم سرکاری لائبریریوں کے بارے میں ہم نے گزشتہ گفتگو میں تفصیل بتادی ہیں۔ آج کی گفتگو میں نجی کتاب خانوں نیز آزاد کشمیر کی لائبریریوں کا ذکر کیا جائے گا۔

صاحب زادہ حضرت شاہ جموں کے رئیس اور وکیل تھے۔ وہ بہت اچھے خطیب اور ماہر طبیب بھی تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۸ء میں ہوا۔ حضرت شاہ انجمن اسلامیہ جموں کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ نے ذاتی لائبریری قائم کر رکھی تھی جس میں فارسی اور عربی کی نایاب کتابیں موجود تھیں۔ افسوس کہ اس لائبریری کی اکثر کتابیں ۱۹۹۲ء کے سیلاب میں ضائع ہو گئیں مگر جو بچ گئیں وہ ان کے ورثاء کے پاس موجود ہیں۔ یاد رہے کہ حضرت شاہ شیخ المشائخ خواجہ نور محمد تیراہی کے پوتے تھے اور انہوں نے چورہ شریف ضلع سے جا کر جموں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جموں کے عالم دین اور درویش مفتی محمد اسحاق نے ایک عمدہ لائبریری قائم کر لی تھی۔ یہ لائبریری ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو گئی۔

اردو کے مشہور ادیب، نقاد اور ڈرامہ نویس صاحب زادہ محمد عمر کا ذاتی کتاب خانہ جموں میں تھا جس میں صاحب زادہ حسن شاہ کے بقول ساڑھے چار ہزار کتابیں تھیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا اور پھر یہ اہم کتاب خانہ مذہبی تعصبات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ سرینگر کے نجی کتاب خانوں میں میر واعظ منزل کا کتاب خانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں اسلامی علوم و فنون پر عربی، فارسی اور اردو زبانوں مین کتابیں موجود ہیں جن سے شائقین بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ سرینگر کے نامور عالم، شاعر اور ادیب کمال الدین شیدا کے پاس بھی ایک عمدہ کتاب خانہ تھا، نادر مخطوطے بھی ان کے ہاں محفوظ تھے۔ پیر شمس الدین حیرت پاندانی نے بھی ذاتی لائبریری قائم کی ہوئی تھی، مفتی محمد شاہ سعادت کشمیر کے معروف مورخ ہو گزرے ہیں۔ آپ کے ہاں ایک ہزار نادر قلمی کتابیں موجود تھیں۔ ریاست کشمیر کی بہترین اور آراستہ لائبریری امر محل جموں میں ہے۔ یہ ڈاکٹر کرن سنگھ کی ذاتی لائبریری ہے، اس میں سماجیات اور مذہب پر سب سے زیادہ کتابیں ہیں۔

ڈوگرہ عہد میں آزاد کشمیر کا علاقہ علمی وادبی لحاظ سے بے حد پسماندہ تھا۔ یہاں تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر تھے۔ کتاب پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تعلیمی ادارے قائم ہوئے اور مطالعہ کتاب کے کلچر کو فروغ ملا۔ آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد میں پہلی بڑی لائبریری خورشید نیشنل لائبریری کے نام سے قائم ہوئی، اس میں تمام جدید سہولتیں میسر تھیں مگر افسوس کہ ۸ اکتوبر کے زلزلے نے اس لائبریری کو تباہ کر دیا۔ لائبریری کے ڈائریکٹر کی عدم توجہی سے لائبریری کو یا تو لوٹ لیا گیا اور یا سردی کی راتوں میں متاثرین زلزلہ کتابوں کو جلا جلا کے آگ تاپتے رہے۔ ملبے سے جو خاک آلودہ کتابیں دستیاب ہوئیں وہ کہا جاتا ہے کہ عارضی طور پر میرپور پہنچا دی گئی ہیں، ضرورت یہ ہے کہ خورشید نیشنل لائبریری کو از سرِ نو قائم کیا جائے۔ دوسری بڑی لائبریری جامعہ آزاد کشمیر کی ہے جو مظفر آباد کے نزدیک چھیلہ کے مقام پر قائم ہوئی۔ زلزلے سے پہلے لائبریری کی خوبصورت اور سہ طبقہ عمارت تیار ہو گئی تھی مگر اس عمارت کو زلزلے میں نقصان پہنچا ہے، اب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر منظور حسین خان اور چیف لائبریرین چوہدری محمد یعقوب اس اہم لائبریری کا احیاء کر رہے ہیں، آزاد کشمیر میں تیسری بڑی لائبریری میاں محمد بخش لائبریری کے نام سے میرپور میں حال ہی میں قائم کی گئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ ایک عظیم لائبریری بن جائے گی۔ ان تین مرکزی لائبریریوں کے علاوہ آزاد کشمیر کالجوں اور خاص طور سے دینی مدرسوں میں بقدرِ ضرورت کتابیں رکھی جاتی ہیں، آزاد کشمیر کے چند ایک محققین کے ہاں نجی کتاب خانے موجود ہیں جن سے تشنگانِ علم وادب پیاس بجھاتے ہیں۔ راقم نے جمال افندی کے نام سے ایک ذاتی لائبریری مظفر آباد میں قائم کر رکھی ہے جس میں پانچ ہزار کے قریب کتابیں موجود ہیں۔

آزاد کشمیر میں علم وادب کے فروغ اور کتاب خانوں کے قیام کے لیے ناگزیر ہے کہ حکومت سرپرستی کرے اور اہلِ قلم کی قدردانی کا اہتمام کیا جائے۔ علم وادب کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں پر انعامات دیئے جائیں، نئی کتابیں سرکاری فنڈ سے خرید کر لائبریریوں کو فراہم کی جائیں جو اہلِ قلم اپنی تصانیف شائع کروانے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کی مالی معاونت کی جائے، ہر ضلعی مقام پر لائبریری قائم کی جائے اور گشتی لائبریریاں چلانے کا انتظام کیا جائے، یہ بات مسلم ہے کہ اگر ہم زندہ رہنا اور ترقی کرنا چاہتے ہیں تو کتاب کے بغیر ہمارا کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ کتاب رکھنے، کتاب پڑھنے اور کتاب لکھنے کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

کشمیر میں خوشنویسی کا فروغ

کشمیر میں فارسی زبان ایک عالم دین سید شرف الدین بلبل شاہ ترکستانی کے ذریعے آٹھویں صدی ہجری میں آئی، بلبل شاہ ۷۲۵ھ میں سرینگر پہنچے اور اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے بدھ مت کا پیرو راجہ رنچن مسلمان ہو گیا اور اس نے صدر الدین کا نام اختیار کر کے کشمیر کا اقتدار سنبھالا۔ کشمیر میں اسلامی علوم اور فارسی کا اصل آغاز ۷۷۵ھ میں ہوا جب زین العابدین بڈھ شاہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ مورخ کشمیر حسن شاہ لکھتا ہے کہ بڈھ شاہ نے برصغیر کے علاوہ خراسان سے علماء کو کشمیر بلایا، مختلف علوم وفنون کے ماہرین او رصنعتکاروں کو کشمیر میں لا کر آباد کیا۔ بڈھ شاہ نے جلد ساز، کاغذ ساز، قالین باف، قلمدان ساز اور تذہیب کار سمرقند سے لا کر وادی میں آباد کیے۔

کشمیر کے تر دماغوں نے خطاطی میں ایسی مہارت حاصل کی کہ وہ شہرہ آفاق ہو گئے۔ کشمیریوں نے ایک ایسی روشنائی ایجاد کی جسے پانی سے دھویا نہیں جا سکتا تھا۔ بڈھ شاہ نے ایک عظیم الشان یونیورسٹی اور دارالترجمہ قائم کیا اور نصاب تعلیم میں خوشنویسی کو شامل کیا چنانچہ جلد ہی کشمیر کے خوشنویسوں نے شہرت حاصل کر لی۔ ان میں ایک ملا جمیل تھا۔ خط نستعلیق میں لکھے ہوئے اس کے کتبے آج بھی کشمیر کی مسجد اور مقبروں میں موجود ہیں۔ اس کے بعد سلطان حسین شاہ کے عہد (۹۷۱۔۹۷۸ھ) میں ایران سے میر علی خوشنویس وادی میں پہنچا اور وہ پھر یہیں کا ہو رہا۔ اس کے شاگردوں میں میر حسن کشمیر مشہور ہوا ہے۔ تاریخ حسن کے مطابق اس کے خط کے نمونے ایران وتوران میں لے جائے جاتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے کشمیری فنکاروں کی سرپرستی کی اور خوشنویسی کو اس دور میں کافی فروغ ہوا۔ اکبر کا درباری خوشنویس محمد حسین کشمیری تھا۔ محمد حسین خطاط میر علی ہروی کا شاگرد تھا۔ محمد حسین کشمیری نے جن شاگردوں کی تربیت کی ان میں حسین کشمیری اور محمد مراد زریں قلم مشہور ہوئے۔ محمد حسین کشمیری جہانگیر کے عہد میں بھی منشی

دربار کے منصب پر فائز رہا۔ اس کا لقب زریں قلم تھا اور اس کے خط کے نمونے طہران کے کتاب خانہ شاہی میں موجود ہیں۔ ملا مراد اور ملا محمد محسن کشمیر کے نامور خوشنویس ہو گزرے ہیں، ملا مراد نے یہ فن میر حسن بن میر علی سے سیکھا تھا۔ شاہجہان نے اسے اپنا درباری خطاط مقرر کیا اور اسے زریں قلم کا لقب دیا تھا، ملا مراد کی خطاطی کے نمونے آستان قدس رضوی مشہد کے کتاب خانے میں موجود و محفوظ ہیں۔

کچھ قطعات بادلیان، استنبول یونیورسٹی اور سپاہ سالار لائبریری طہران میں پائے جاتے ہیں۔ محمد علی کشمیری محمد حسین زریں قلم کا بیٹا تھا اور خوشنویسی میں بڑی مہارت رکھتا تھا، خاص طور سے نستعلیق جلی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا، کشمیر کا ایک کاتب محمد ابراہیم ہوا ہے۔ ملا باؤ کشمیری شاہجہان کے دربار سے متوسل تھا۔ وہ نستعلیق، تعلیق نسخ اور شکستہ میں مہارت رکھتا تھا۔ کشمیر کا ایک فارسی گو شاعر حسن کشمیری خوشنویس بھی تھا۔ عالمگیر کی بیٹی زیب النساء نے ملا محمد شفیع کی نگرانی میں کشمیر میں ایک ادارہ قائم کر دیا تھا جس میں ماہر خوشنویس، نقاش اور طلا کار کام کرتے تھے۔

حیدر کشمیری گیارہویں صدی ہجری کا ایک کامل خطاط تھا۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رسالہ طہران کے دانش کدہ الہیات کی لائبریری میں موجود ہے۔ کشمیر کا خوشنویس ہدایت اللہ زریں قلم عالمگیر کا لائبریرین اور مشق خط میں شہزادوں کا استاد تھا۔ حافظ عبداللہ فتح کدلی قرآن مجید کی کتابت کر کے گزر اوقات کرتا تھا۔

سید محمد رضا مشتاق کشمیری فارسی کا شاعر تھا جس کا ذریعہ معاش خوشنویسی تھا۔ کشمیر میں افغانوں کے دور حکومت کا مشہور خطاط پنڈت دیارام کاچرو تھا، جس کا تخلص خوشدل تھا، سکھوں کے عہد میں بھی کشمیر میں فن خوشنویسی کا رواج رہا، مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور میں مرزا سیف الدین سرکاری وقائع نویس اور خوشنویس تھا۔ خواجہ عبدالرحمن نقشبندی خواجہ امیر الدین پکھلی وال کا مرید اور خوشنویس تھا۔ میر حبیب اللہ کاملی اور اس کا بیٹا میر غلام احمد مختار اچھے خوشنویس تھے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد ۱۳۰۳۔ ۱۲۷۴ھ پر محیط ہے، اس عہد میں جن خوشنویسوں نے نام پیدا کیا ان میں امام دیروی، محمد تقی کشمیری اور احمد علی کشمیری قابل ذکر ہیں۔ روس کے شہرۂ آفاق سکالر ایوانوف نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخوں کی فہرست میں صحیح لکھا ہے کہ آج

بھی وسط ایشیا اور ایران کے کتاب خانوں میں کشمیرژ کاتبوں اور خطاطوں کے ہاتھ کے تحریر کردہ قلمی نسخے بکثرت ملتے ہیں، کشمیر کے خوشنویسوں کی اختراع کا یہ عالم کہ ان کا خط، خط کشمیری ان کی جلد جلد کشمیری اور ان کا کاغذ، کاغذ کشمیری مشہور ہوا۔

کشمیر کے خوشنویس خط کوفی، نسخ ثلث، رقاع ریحان، نستعلیق، شکستہ، گلزار، ناخن میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ علامہ اقبال نے اہل کشمیر کو بجاطور پر ''چرب دست وتر دماغ'' قرار دیا ہے۔ چنانچہ آج کی اس گفتگو میں ہم نے کشمیریوں کی فن خوشنویسی میں مہارت کی جو کہانی سنائی ہے وہ اقبال کے اسی قول کی تصدیق کرتی ہے۔

کشمیر فنون لطیفہ کا مرکز

کشمیر میں مصوری کی روایت بہت قدیم ہے۔ مصوری کا اسلوب جداگانہ اور یگانہ تھا، فنون لطیفہ کے اصل فروغ کا زمانہ سلطان زین العابدین کا عہد حکومت ہے، سلطان کے دربار سے وابستہ مشہور مصور ملا جمیل تھا، براؤن لکھتا ہے کہ کشمیری مصور اپنے موقلم سے نازک تاثر پیدا کر لیا کرتے تھے۔

سلاطین کشمیر فن خطاطی کے قدردان تھے۔ کشمیر کے خطاطوں نے خط نسخ اور نستعلیق کو رواج دیا۔ ان کے خط کے نمونے ایشیا اور یورپ کے کتاب خانوں میں آج بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں مسجدوں اور مقبروں پر بھی ان کے لکھے ہوئے کتبے دیکھے جاسکتے ہیں، زین العابدین نے ترکستان اور ایران سے بہت سارے خوشنویس بلائے اور ان کو جاگیریں دیں۔ مغل دربار سے درجنوں کشمیری خطاط وابستہ رہے۔

کشمیر میں اعلیٰ قسم کا نرم پتھر پایا جاتا ہے جس سے قدیم زمانے میں مورتیاں تراشی جاتی تھیں ورود اسلام کے بعد ستون اور لوح مزار بنائے جانے لگے۔ بارہ مولہ کے قریب چرچ مشن سکول سے سنگ تراشی کا ایک نمونہ ملا تھا جس میں ایک گھوڑ سوار دکھایا گیا ہے۔ سوار دو لبادے پہنے ہوئے ہے اور سوار نے چست کوٹ پہنا ہوا ہے۔ سوار کے ہاتھ میں کمان ہے فتراک میں تیر بھرے ہوئے ہیں، ایک بڑی تلوار، دو خنجر، ایک کٹارہ، ایک تیر اور ایک ڈھال اس کے پاس ہے۔

کشمیر میں ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ فن تعمیر کا ملتا ہے، مسجدیں اور مقبرے بھی اعلیٰ ترین فن معماری کا نمونہ پیش کرتے ہیں، سرینگر میں سید محمد مدنی کا مقبرہ آج بھی موجود ہے۔ اس مقبرہ کی تعمیر ۱۴۴۴ء میں ہوئی تھی۔ اس مقبرے میں سرخ اینٹ استعمال کی گئی جو ایران سے لائی گئی تھی۔ عمارت کی ٹائل پر بنی ہوئی ایک جانور کی شبیہ تھی۔ جانور کا جسم چیتے کا، دھڑ انسان کا ہے

جانور اپنی دم کو کمان بنائے ہوئے ہے۔ دم کے سرے پر اژدھا جیسے جانور کا سر ہے اور قریب سے ایک لومڑی بادلوں اور پھولوں کے درمیان سے یہ نظارہ دیکھ رہی ہے۔ شبیہ کی یہ تفصیل ایک آرکیالوجیکل سروے سے لی گئی ہے جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔

وادی میں لکڑی کی عمارات زیادہ ہیں اور وہ اس لیے کہ لکڑی کے ڈھانچے پر بنی ہوئی عمارتیں زلزلہ میں پتھر اور اینٹ کی عمارتوں کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ کشمیر میں لکڑی وافر ہے اور لکڑی سے عمارت آسانی سے بن جاتی ہے۔ مسجدوں اور مقبروں کی شکل چوکور ہے۔ وادی میں چوبی فن تعمیر کی ایک اعلیٰ مثال سرینگر میں مسجد شاہ ہمدان ہے جو خانقاہ معلیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر اینٹوں کی بنیاد پر واقع ہے۔ یہ دومنزلہ عمارت ہے اس کی چھت تین تہوں میں بنی ہوئی ہے اور اس کے اوپر موذن کے لیے ایک شہ نشین اور شہ نشین کے اوپر گنبد ہے۔ گنبد کے اوپر کلس ہے جس کی اونچائی سطح زمین سے ۱۲۵ فٹ ہے۔

سرینگر میں سلطان سکندر کی بنوائی ہوئی جامع مسجد بھی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ کشمیر کے پل توڑے دار پلوں کے اصول پر بنائے گئے۔ پل کے پشتے دیودار کے لٹھوں کو جوڑ کر بنائے جاتے تھے۔ فتح کدل اسی اصول پر بنایا گیا تھا۔

کشمیر آبشاروں، جھرنوں اور ندیوں کی سرزمین ہے اور چہچہانے والے پرندوں کا گلشن۔ سدابہار موسیقی اس خطے کی پہچان ہے، درباروں اور خانقاہوں میں موسیقی کا چلن ہمیشہ سے رہا۔ سلاطین کے عہد میں موسیقار وسط ایشیا اور ایران سے آ کر وادی میں آباد ہوئے۔ سلطان زین العابدین موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس کا بیٹا حیدر ساز بجانے میں مہارت رکھتا تھا۔ سلطان کے پوتے حسن شاہ نے دکن سے مغنی بلوائے تاکہ کشمیر میں موسیقی کو رواج دے سکیں۔ سلطان یوسف شاہ کو موسیقی سے زبردست دلچسپی تھی۔ اس کی ملکہ حبہ خاتون ایک عظیم موسیقار تھی اور اس نے ایک راگ ایجاد کیا تھا جسے راست کشمیری کہا جاتا ہے، کشمیر کی کلاسیکی موسیقی صوفیانہ کلام کے نام سے مشہور ہوئی۔ کچھ ہندوستانی راگوں کی طرح جیسے بھیرویں للت اور کلیان اور کچھ ایرانی نام جیسے اصفہانی درگاہ، پنج گاہ، عراق وغیرہ۔ صوفیانہ کلام کورس میں گایا جاتا ہے۔ مقبول ساز جو لوک موسیقی میں استعمال ہوتا تھا رباب تھا۔ عود کا استعمال زین العابدین کے عہد میں ہونے لگا۔ لوک موسیقی میں چکھری طنبور اور نغمہ مشہور ہیں۔ چھکری سب سے زیادہ مقبول ہے۔

کشمیر کی موسیقی

وادی کشمیر کی جغرافیائی صورتحال اور مناظر فطرت کی رنگارنگی نے یہاں موسیقی، شاعری اور تصوف کو پروان چڑھایا ہے۔ یہ خطہ آوازوں اور سروں کا خطہ ہے۔ غلام محی الدین صوفی نے صحیح لکھا ہے کہ کشمیر میں بچہ موسیقار پیدا ہوتا ہے۔ کسان کھیتوں میں، ہانجی شکاروں میں گیت گاتا ہے کہ اس کی طبیعت اور روح میں موسیقی رچی بسی ہوتی ہے۔ قدیم ترین کتاب ''نیل مت پران'' میں لکھا ہے کہ تہواروں میں موسیقی سے لوگ لطف اندوز ہوتے تھے اور ساز وسرود کی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ قرون اولی میں کشمیری عوام کی معاشرت پر فن موسیقی اثر انداز رہتی تھی، موسیقی کے فن نے کشمیر کے مندروں اور بدھ ویہاروں میں جنم لیا پھر یہ فن محفلوں میں پھیل گیا۔

محترمہ نصرت نثار کی تحقیق یہ ہے کہ کشمیر میں موسیقی کو آج سے دو ہزار قبل فروغ ہوا۔ پھر راجہ للتادتیہ نے سرود کو درباری مشغلہ بنا دیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں سازگ دیو موسیقی کا ماہر ستاد ہو گزرا ہے۔ اس کی تالیف سنگیت رتنا کو فن موسیقی پر بہترین مواد پیش کرتی ہے۔

ورود اسلام کے بعد سلطان بڈھ شاہ کے عہد میں موسیقی کا چلن عام ہوا اور اسے باقاعدہ سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔ سلطان نے ایران وتوران کے موسیقار اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے، مغل بادشاہوں نے موسیقی، رقص اور مصوری کو فروغ دیا۔ کشمیری موسیقی میں صوفیانہ موسیقی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس موسیقی میں ایک استاد تین ساتھی موسیقاروں کے ساتھ مل کہ ایک راگ کو سازوں کی سنگت کے ساتھ چھیڑتا ہے۔ نعت اور منقبت مختلف مقاموں کے تحت گائے جاتے ہیں۔

جب ۷۲۵ھ میں شاہ ہمدان کشمیر میں تشریف لائے تو آپ کے ہمراہ علماء اور موسیقاروں کی ایک جماعت بھی کشمیر میں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کا دامن کشمیری اور ایرانی راگوں اور راگنیوں اور سرسنگیت سے بھرا ہوا ہے۔ بڈھ شاہ کے بعد اس کا جانشین سلطان حیدر شاہ راگ رنگ کا شوقین تھا سلطان حسن شاہ کے بارے میں محب الحسن لکھتا ہے:

حسن شاہ کی آواز بڑی سریلی تھی وہ فارسی، کشمیری اور سنسکرت کے گیت گایا کرتا تھا، اس کے دربار میں بارہ سو کے لگ بھگ ارباب فن جمع ہو گئے تھے۔ مرزا حیدر دغلت نے کشمیر کو فتح کیا تو موسیقی کو بھی ترقی دی۔ اس کے عہد میں بڑے بڑے استادان فن پائے جاتے تھے۔ چک خاندان کے بادشاہوں نے فن موسیقی کو عام کیا۔ یوسف شاہ موسیقی کا شیدائی تھا؟ کہا جاتا ہے کہ یوسف شاہ کو موسیقی میں اس قدر مہارت تھی کہ ایک مرتبہ اس نے دربار اکبری کے موسیقار تان سین کو ٹوک دیا تھا، ملکہ کشمیر حبہ خاتون نے ایرانی نمونے پر کشمیری میں غزلیں لکھیں اور کشمیر میں فارسی موسیقی کو رواج دیا۔

راجہ پرتاب سنگھ کے دور میں استاد رمضان ہو گزرا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزاد کشمیر جموں اور سرینگر میں نشر گاہیں قائم ہوئیں اور موسیقی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس مختصر تعارف کے بعد اب ہم چند کشمیری گیتوں اور راگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ چھکری کشمیری کا مشہور راگ ہے یہ لوک موسیقی کی مقبول قسم ہے۔ اس میں چار یا پانچ موسیقار حصہ لیتے ہیں اور سازنگ، رباب تمک کاڑی استعمال کرتے ہیں۔ غلام محمد بٹ، غلام محمد ڈار، علی محمد شیخ، غلام حسن صوفی چھکری گانے والے مشہور ہیں۔ روف لوک موسیقی کی ایک قسم ہے جس کا تعلق عید اور شادی بیاہ کی تقریبات سے ہے۔ شروع میں عورتیں ہی روف گایا کرتی تھیں۔ ونہ ون ان کشمیری گیتوں کو کہتے ہیں جو عورتیں شادی بیاہ کے موقعوں پر گاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ونہ ون حبہ خاتون کی ایجاد ہے، لڑی شاہ مردوں کا گیت ہے، ایک مخصوص گروہ کے لوگ گلی کوچوں میں چمٹا بجا بجا کر جو گیت حالات کے بارے میں گاتے ہیں وہ لڑی شاہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک دیہاتی گیت ہے اور اس میں آفات وحوادث کے ساتھ ساتھ معاشرتی برائیوں کا ذکر بھی ہوتا ہے اسے ہم کشمیری شہر آشوب کہہ سکتے ہیں۔

بانڈ پاتھ بانڈ کشمیر کے پیشہ ور موسیقار ہیں، سارنگی اور شہنائی ان کے ساز ہیں ہلکی موسیقی جدید ترین موسیقی ہے۔ اس موسیقی کے ابتدائی ریکارڈوں میں غلام نبی دل سوز اور محمود شہری کے گائے ہوئے گیت لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتے تھے۔ آزاد کشمیر ریڈیو نے ہلکی موسیقی کو سہارا دیا اور پیرا مرد اور عورت مل کر گاتے تھے۔

کشمیر کے کھیل اور مشغلے

کشمیر میں اندرون در گیمز کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے۔ خاص طور سے شطرنج کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں امراء اور عوام دلچسپی رکھتے تھے، اس کھیل کو ایک عمومی حیثیت حاصل تھی۔ سردیوں کے موسم میں جب وادی برف پہن کر سو جاتی تو لوگ کانگڑیاں گرم کرتے اور شطرنج کھیلنے میں مصروف ہو جاتے، یہ کھیل تفریح کا ایک آسان اور سستا ذریعہ تھا۔ تفریح کے ساتھ ساتھ شطرنج کھیلنے والوں کی ذہانت میں بھی اضافہ ہوتا ہے موسم گرما میں کشمیر کے میدانوں میں پولو کھیلا جاتا تھا۔ پولو دراصل ایرانی کھیل ہے جس کا نام چوگان بازی ہے۔ فارسی میں گیند کو گو کہتے ہیں اور اسی سے یہ ضرب المثل بنی ہے ہمیں گوی وہمیں میدان۔ اردو میں یہ ضرب المثل اس طرح استعمال ہوتی ہے، گھوڑا میدان حاضر ہے، کشمیر میں چوگان لداخ سے لایا گیا تھا، یہ امراء اور رؤساء کا مرغوب کھیل تھا، پولو گلگت اور چترال میں آج بھی کھیلا جاتا ہے۔ کشمیر کا سلطان علی شاہ پولو کا دلدادہ تھا اور اس کی موت بھی چوگان کھیلتے ہوئے واقع ہوئی تھی۔ ان کھیلوں کے علاوہ کشمیر میں اونچے طبقے کا پسندیدہ مشغلہ شکار بھی رہا ہے، کشمیر کے جنگلوں میں چرندوں، پرندوں اور درندوں کی کمی نہ تھی۔ لوگ شیر، چیتا، ریچھ، ہرن، بارہ سنگھا، تیتر، مارخور اور جنگلی گائے کا شکار کرتے تھے۔ کشمیر کا مشہور بادشاہ سلطان شہاب الدین شیر کے شکار کرنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا، وہ شیر کا شکار تیر اور تلوار سے کرتا تھا، جون راج لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان شہاب الدین نے شیر کو تلوار سے مارنے کی کوشش کی مگر شیر نے حملہ کر دیا اور سلطان نے مشکل سے جان بچائی۔ شکرے (باز) سے شکار کھیلنے کا فن کشمیر میں ایران سے آیا تھا۔ اہل کشمیر کشتیوں اور شکاروں میں بیٹھ کر مناظر فطرت کا نظارہ کرتے اور جب کوئی باز جنگلی مرغ کا شکار کرتا تو اس نظارے سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ اس کے علاوہ تیر اندازی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا کھیل بھی کشمیر میں مقبول رہا ہے۔ آج کا گتکا دراصل نیزہ بازی ہی کی ایک شکل ہے کشمیر میں گتکا عام طور سے شادی بیاہ کے

موقعوں پر کھیلا جاتا ہے۔ کشمیر میں ہاکی بھی کھیلی جاتی تھی۔ کشمیری ضرب المثال کی ڈکشنری میں درج ہے کہ جمعہ کے دن سرینگر کے ایک علاقے کے نوجوان دوسرے علاقے کے نوجوانوں کو چیلنج کرتے کہ وہ تفریح کے لیے کسی خاص مقام پر جمع ہوں اور ڈنڈوں سے مقابلہ کریں۔ کشمیر کے شعبدہ باز بھی اپنے اپنے کرتب دکھاتے تھے۔ مشہور سیاح مارکوپولو نے ان شعبدہ بازوں کی تفصیل دی ہے۔ زین العابدین بڈھ شاہ کے عہد حکومت میں عوام کا مقبول مشغلہ آتش بازی رہا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا کشمیر اور ریاست کے دیگر حصوں میں شیر، چیتا، ہرن، بارہ سنگھا اور مارخور کا شکار بڑے شوق اور اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ شیر اور چیتا کا شکار گوشت کے لیے نہیں بلکہ خوبصورت کھال کے لیے کیا جاتا تھا۔ یہ ایک مشکل شکار ہے اور شیر کو شکار کرنے والا شکاری اپنے آپ کو دلیر سمجھتا ہے کہ اس نے شیر جیسے خطرناک درندے کا شکار کیا ہے۔ شیر اور چیتے کی کھال سکھا کر امراء کے محلات کی زینت بنتی تھی۔ یہ کھال بادشاہوں کو بطور تحفہ بھی دی جاتی تھی۔ شیر کا گوشت سکھا کر رکھ لیا جاتا اور عوامی توہم پرستی کی رو سے اگر اس گوشت کی دھونی بچوں کو دی جاتی جو سوکھے کا شکار ہوں تو وہ ٹھیک ہو جاتے تھے، چیتے کی منقش کھال ثروت مندوں کے خوبصورت مکانوں کی دیواروں پر سجائی جاتی تھی، بارہ سنگھا کے سینگ بھی ڈیوڑیوں، ایوانوں اور مہمان خانوں میں سجائے جاتے تھے۔ بارہ سنگھا کا سینگ اگر پتھر پر گھس کر نمونیے کے مریض کو چٹایا جاتا تو عوام کا عقیدہ یہ تھا اس سے مریض کو شفا رہو جاتی تھی، مارخور کشمیر کے پہاڑوں کے علاوہ تبت اور بلتستان وغیرہ میں بہت ہوتا ہے۔ مارخور کا شکار شوق سے کیا جاتا تھا۔ مارخور کی کھوپڑی شاہی محلوں اور امراء کے گھروں میں رکھی جاتی تھی اور اسے امتیاز دلیری اور امارت کا نشان سمجھا جاتا تھا، آج بھی کشمیر تبت، لداخ، بلتستان، گلگت اور چترال میں قدیم کھاتے پیتے گھرانوں میں آرائش کی یہ چیزیں مل جاتی ہیں۔ انقلاب زمانہ اور تبدیلی معاشرہ کے نتیجے میں آج یہ کھیل تقریباً متروک ہو چکے ہیں۔ تاہم ہاکی اور پولو اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اہتمام سے کھیلا جاتا ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی یہ کہ آج وہ جانور کم ہو گئے ہیں جن کا قدیم دور میں شکار کیا جاتا تھا۔ آج ماحولیات کا جو فلسفہ متعارف ہوا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ آج درندوں، پرندوں اور چرندوں کا شکار نہ کیا جائے اور اس کی جگہ دیگر کھیلوں کو فروغ دیا جائے۔

کشمیر میں تصوف کا فروغ

سرزمین کشمیر میں دین اسلام کے نفوذ کے بعد یہاں صوفیاء کے چار سلسلے یعنی نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ اور سہروردیہ متعارف ہوئے۔ اسلام اس خطے میں آٹھویں صدی ہجری میں پہنچا اور اپنی اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی تعلیمات سے یہاں ایک انقلاب پیدا کیا۔ ان چار سلسلوں کے علاوہ کشمیر وادی میں رشی سلسلہ مستحکم ہوا اور اسی خاک سے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ رشی صوفی عام طور پر تارک دنیا ہوتے تھے، سلسلہ کبرویہ بھی یہاں مقبول رہا۔

کشمیر کے علماء نے مدارس اور صوفیاء نے خانقاہیں تعمیر کروائیں، یہ ادارے علم و تصوف فارسی اور عربی زبان کی نشر و اشاعت میں پیش پیش رہے، کشمیر کے صوفیاء کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ وہ تقریباً سب کے سب مصنف یا شاعر تھے۔ بعد کے ادوار میں ان کی صوفیانہ تعلیمات کشمیر کے دیگر علاقوں جموں، راجوری، پونچھ، سکردو اور موجودہ آزاد کشمیر میں پہنچیں۔ صوفیائے کشمیر میں نمایاں نام ان حضرات کے ہیں۔ سید شرف الدین، عبدالرحمن، بلبل شاہ، للہ عارفہ، امیر کبیر حضرت علی ہمدانی، شیخ نورالدین ولی، سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم شیخ بابا داؤد خاکی، ملا محمد یعقوب صرفی وغیرہ۔

سید شرف الدین عبدالرحمن بلبل شاہ کشمیر کے اولین مبلغ اسلام ہیں جو ۷۲۵ھ میں وادی میں داخل ہوئے۔ ان کا وطن ترکستان تھا اور سلسلہ سہروردیہ کے بزرگ تھے۔ آپ خواجہ محمد مقیم ترکستانی اور ملا احمد علامہ کے ہمراہ کشمیر آئے تھے۔ ان کی سیرت سے متاثر ہو کر کشمیر کا بودھ راجہ رنچن مسلمان ہوا۔ سید بلبل شاہ نے سرینگر میں ایک مدرسہ اور مسجد کی بنیاد رکھی اور لنگر جاری کیا جو بلبل لنگر کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ نے وادی میں تین سال قیام کیا اور ۷۲۷ھ میں فوت ہوئے۔ خواجہ محمد اعظم نے ''خاص الہ'' سے مادہ تاریخ نکالا۔ سال تاریخ وصل بلبل شاہ، بلبل قدس گفت ''خاص الہ'' آپ کا مزار سرینگر میں دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔ آپ کی وفات

کے بائیس سال بعد سید جلال الدین بخاری جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے نام سے مشہور ہیں وادی میں تشریف لائے، آپ حضرت شیخ رکن عالم کے مرید تھے۔

للہ عارفہ کشمیر کی نیم مجذوب صوفیہ تھی، وہ سید حسین سمنانی کی مریدہ تھی وہ صوفیاء کی مجالس میں بیٹھتی اور تصوف اسلامی کے رموز سیکھتیں۔ للہ عارفہ نے سید جلال الدین بخاری اور حضرت امیر کبیر سے بھی ملاقاتیں کی تھیں، وہ ظاہری رسوم ورواج کی مخالفت کرتی تھی۔ للہ عارفہ نے توحید کی تبلیغ کی۔ کہتے ہیں کہ بے شمار کرامات کا للہ عارفہ سے ظہور ہوا تھا۔ کشمیری اس عارفہ کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اسے لل موج یعنی مادر بزرگ کے نام سے یاد کرتے ہیں، للہ عارفہ کشمیری زبان کی عظیم شاعرہ تھی اس کی شاعری پر گرائرسن سرارر چرڈ ٹمپل نے کام کیا ہے۔ للہ عارفہ کی وفات بیج بہاڑہ میں ۷۷۴ھ میں واقع ہوئی مگر اس کی قبر کا سراغ نہیں ملتا۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی ۷۱۴ھ میں ایران کے شہر ہمدانی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماموں سید علا علاالدولہ سمنانی سے حاصل کی۔ جب بلوغ کو پہنچے تو شیخ محمود مزدقانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حدیث کا درس شیخ نجم الدین سے لیا۔ اکیس سال تک سیر وسیاحت کرتے رہے، چین وترکستان کی سیر کی اور چودہ سو اولیاء سے استفادہ کیا بارہ مرتبہ حج کیا۔ ۷۷۴ھ میں کشمیر پہنچے سات سو علماء اور صوفیاء کی جماعت آپ کے ہمراہ کشمیر آئی اور صنعت وحرفت کو فروغ دیا۔ آپ تیسری بار ۷۸۶ھ میں کشمیر تشریف لائے۔ واپسی پر تاجکستان جاتے ہوئے پکھلی میں ۷۸۶ھ میں وفات پائی۔ ان کی عمر تہتر سال تھی، مریدین آپ کے جسد خاکی کو ختلان لے گئے اور وہیں دفن کیا۔ اس طرح آپ کشمیر اور سنٹرل ایشیا کے درمیان ایک وحدت کی علامت بن گئے۔

آپ کا شمار عظیم صوفیاء علماء اور شعراء میں ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے آپ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

خطہ را آں شاہ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دین

آپ ایک بڑے مصنف بھی تھے۔ چنانچہ فارسی اور عربی میں آپ کی چوالیس کتابوں کی فہرست ملتی ہے۔ آپ کی مشہور کتاب ''ذخیرۃ الملوک'' ہے جس میں آداب کشورداری کا بیان ہوا ہے۔ سید علی ہمدانیؒ کی غزلیات کا مجموعہ ''چہل اسرار'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

گشتہ تا محو تجلائے جمالش جانم
دیدہ ام حسن و جمالی کہ درو چرانم
روز گاریست کہ ہم طالب و ہم مطلوبی
طرفہ حالیت کہ ہم در دم و در مانم

ترجمہ: جب سے میری روح اس معشوق حقیقی کی تجلیات میں محو ہوئی ہے۔ میں نے ایسا حسن و جمال دیکھا ہے جس میں حیران ہوں ایک مدت سے میں طالب ہوں اور مطلوب بھی ہوں۔ یہ عجب حالت ہے کہ میں درد بھی ہوں اور درد کا درمان بھی۔ سرینگر میں آپ کی خانقاہ معلیٰ گزشتہ صدیوں سے اسلامی تہذیب وتمدن اور ملی آزادی کا مرکز رہی ہے اور آج بھی ہے۔ کشمیر کے چند دوسرے صوفیاء۔

شیخ نورالدین ولی متوفی ۸۴۲ھ کشمیر کے اکابر صوفیاء میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ۷۷۹ھ میں قصبہ کیموہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ سالارالدین اور والدہ کا نام سدرہ تھا۔ والد کا تعلق راجگان سے تھا اور وہ یاسمین رشی کے ذریعے مسلمان ہوئے تھے۔ شیخ نورالدین نے کشمیر میں صوفیہ کے رشی سلسلے کو فروغ دیا۔ رشی کے معنی خدائی حکیم اور دوست خدا کے ہیں۔ رشی صوفی پھل اور سبزیاں کھاتے اور پودے لگاتے اور تجرد کی زندگی گزارتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح ہندو بھی آپ سے عقیدت رکھتے ہیں اور آپ کو نندرشی کہتے ہیں۔ آپ بین المذاہب اتحاد اور ہم آہنگی کی علامت بن گئے ہیں۔ حضرت شیخ کشمیری زبان کے بہت بڑے شاعر بھی تھے کشمیر میں آپ کا کلام اسی طرح مقبول عوام ہے جس طرح سندھ میں حضرت شاہ لطیف، پنجاب میں بلھے شاہ اور سرحد میں رحمان بابا کا کلام پسند کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ ۸۴۲ھ میں فوت ہوئے اور چرار شریف کے مقام پر آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

شیخ حمزہ مخدوم ۹۸۴ھ میں فوت ہوئے۔ وہ صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے۔ آپ ۹۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام بابا عثمان تھا۔ شیخ حمزہ مخدوم کے کہنے پر طاہر عشائی، ملا یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی دہلی پہنچے تھے اور اکبر کو دعوت دی تھی کہ وہ کشمیر کو اپنا صوبہ بنالے۔ آپ کے حالات زندگی تذکرۃ العارفین اور تذکرۃ المرشد میں مل جاتے ہیں۔

شیخ العلماء بابا داؤد خاکی شیخ حمزہ مخدوم کے مرید تھے۔ خاکی ۹۲۸ھ میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے لاہور اور ملتان کا سفر بھی کیا تھا۔ آپ اسلام کے مبلغ اور نظریہ وحدۃ الوجود کے ماننے والے تھے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

گہ بہ مسجد روم و گاہ بہ مے خانہ شوم
من بی چارہ ترامی طلبم از ہرسو

آپ کے مریدوں میں خواجہ محمد پارسا مشہور ہوئے۔ وفات ۹۹۴ھ میں پائی۔ ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔

ملا محمد یعقوب صرفی

آپ کی پیدائش ۹۲۸ھ میں سرینگر میں ہوئی۔ بچپن میں قرآن حفظ کیا، صرفی فارسی کے شاعر تھے اور ملا عبدالرحمن جامی کے شاگرد ملا آنی ختلانی کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ انیس سال کی عمر میں کچھ مدت کے لیے سمرقند چلے گئے تھے۔ صرفی ایک صوفی ہونے کے علاوہ مفسر، محدث، فقیہہ، نثر نویس، سیاح اور سیاستدان تھے۔ ایران و خراسان کے بڑے بڑے علماء اور صوفیاء سے فیض حاصل کیا تھا۔ خواجہ معین الدین چشتی اور شاہ عبدالعزیز سے مستفید ہوئے تھے۔ تاشقند، یارقند، مشہد طوس، شام، عراق، بغداد، حجاز اور یمن کی سیاحت کی تھی۔ یعقوب صرفی مجدد الف ثانی کے استاد تھے، اکبر اعظم آپ سے عقیدت رکھتا تھا ''شیخ امم بود'' سے مادہ تاریخ وفات نکلتا ہے یعنی ۱۰۰۳ھ۔

ملا جامی کی تقلید میں صرفی نے خمسہ لکھا ۔کلام میں فلسفہ، اخلاق، تصوف اور عشق کے مطالب ملتے ہیں۔

وحدۃ الوجود یعقوب صرفی کا یہ قطعہ سنیے:

خوش آنکہ دلش صاف ہر شود
بیرون زہمہ آشتی و جنگ شود
بادلبر من کہ رنگ اوبی رنگیست
ہم رنگ کسی شود کہ بی رنگ شود

ترجمہ: مبارک ہے وہ آدمی جس کا دل ہر رنگ سے پاک ہو اور وہ ہر صلح و جنگ سے باہر ہو جائے۔ میرے محبوب حقیقی سے جن کا رنگ بے رنگی ہے، ہم آہنگ وہی ہوتا ہے جو خود بھی بے رنگ ہو۔ ملا یعقوب صرفی کا ایک اور قطعہ پیش ہے:

درصد ہزار آئنہ یک دوست جلوہ گر
در ہرچہ بینم آن رخ نیکوست جلوہ گر
خلقی بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست
وین طرفہ ترکہ دوست بہر سو ست جلوہ گر

ترجمہ: ہزار آئینوں میں وہی ایک دوست دکھائی دیتا ہے۔ میں جس چیز پر نظر ڈالوں وہی خوبصورت چہرہ جلوہ گر ہے خلقت دوست کے لیے ہر طرف ماری ماری پھرتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دوست تو ہر طرف جلوہ گر نظر آتا ہے۔

درگاہ حضرت بل

وادی کشمیر آٹھویں صدی ہجری سے لے کر آج تک ایک مضبوط اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز رہی ہے۔ یہ وادی خانقاہوں اور مسجدوں کی وادی ہے۔ مناظر فطرت کو دیکھیں تو چشموں، آبشاروں، باغوں اور نہروں کی یہاں فراوانی ہے، کشمیر کو اس لیے بھی شہرۂ آفاق سمجھا جاتا ہے اور یہ کشمیر کا ایسا امتیاز ہے جو اسے ایک خاص اعزاز وافتخار عطا کرتا ہے کہ یہاں سرور کائنات محسن انسانیت ہادی امم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک رکھا ہوا ہے۔ فارسی کے لفظ مو کو اردو میں بال کہتے ہیں۔ تقدس واحترام کے پیش نظر بال کو حضرت کا لقب دیا گیا یوں وہ مقام مقدس جہاں موئے مبارک محفوظ ہے اسے درگاہ حضرت بل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

درگاہ حضرت بل سرینگر کی جھیل ڈل کے ساتھ نسیم باغ کے خوبصورت گوشے میں تعمیر کی گئی ہے۔

موئے مبارک کشمیر کیسے پہنچا؟ اس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے لیکن اختصار سے جو کچھ عرض کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ۱۰۴۴ھ کا واقعہ ہے ایک متقی اور پرہیزگار تاجر جس کا نام سید محمد عبداللہ تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک ومقدس موعرب سے ہندوستان لایا۔ یہ سلطان شاہجہان کا زمانہ تھا۔ سلطان نے علماء سے تحقیق کروائی اور علماء نے اتفاق سے فیصلہ دیا کہ یہ موئے مبارک اصلی ہے۔ سلطان مذکور نے سید عبداللہ کی تعظیم وتکریم کی اور اعزاز سے نوازا۔ شاہجہان کے دور میں موئے مبارک اسی سید عبداللہ کی تحویل میں رہا۔ جب اورنگزیب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس نے یہ موئے مبارک کشمیر کے ایک تاجر خواجہ نورالدین عشائی کے ذریعے سرینگر پہنچا دیا۔ کشمیر میں موئے مبارک کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ درود وسلام کے زمزموں میں اسے وصول کیا گیا۔ کشمیری مسلمانوں نے موئے مبارک کو قرۃ العین اور فرحت القلوب قرار دیا، یہ اعزاز عالم اسلام میں صرف کشمیر کو ہی حاصل ہوا۔ سرینگر میں نسیم باغ کے ایک گوشے میں خوبصورت مسجد بنوائی گئی اور مسجد کے ملحق ایک حجرہ مبارک میں یہ موئے مبارک محفوظ کر دیا گیا۔

درگاہ حضرت بل ایک اہم زیارت بن گئی۔ یہ حجرہ جمعہ کے دن زیارت کی غرض سے کھولا جاتا ہے جہاں دور دراز اور شہر کے اہل ایمان آ کر موئے مبارک کی زیارت کرتے ہیں اور ایمان وسکون خاطر کا خزانہ سمیٹ کر گھروں کو لوٹتے ہیں۔ سرینگر میں نماز جمعہ کے اجتماعات جامع مسجد خانقاہ معلیٰ میں منعقد ہوتے ہیں لیکن درگاہ حضرت بل میں خاص سوز وگداز کی کیفیت نظر آتی ہے۔ نماز جمعہ کے بعد ہزاروں مومنین کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ لوگ درود وسلام کا ورد کرتے ہوئے گروہ در گروہ موئے مبارک کی زیارت کر کے مسرور ہوتے ہیں۔ اکثر زائرین پر جذبات کی ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اشکوں کے ہار پرونے لگتے ہیں۔

اورنگزیب عالمگیر کے دور سلطنت میں یہاں جو مسجد تعمیر کی گئی تھی اسے اب وسیع تر کر دیا گیا ہے۔ اس مسجد کے نقش ونگار سرزمین گل ولالہ کے چرب دست کاریگروں نے خاص ذوق لگن اور عقیدت سے سنوارے تھے۔ ڈاکٹر ایم۔ ایس ناز کہتے ہیں کہ نقش ونگار کی چمک دمک اور سج دھج آج بھی قائم ہے جس طرح کشمیر کے پنڈت حضرت شیخ نورالدین رشی کے مزار پر برکت کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ ہندو درگاہ حضرت بل پر حاضر ہو کر دعائیں مانگتے اور برکت و شفا طلب کرتے ہیں۔

سرزمین کشمیر کی یہ خوش قسمتی ہے اور قابل رشک امتیاز ہے کہ یہاں اس رحمت عالم ہستی کا موئے مبارک محفوظ ہے جن کی عنایت سے یہ خطہ نور توحید سے منور ہوا اور جن کی نگاہ بندہ نواز سے ریاست جموں وکشمیر کے باشندے آزادی ووقار کے متمنی ہیں۔

خانقاہ معلیٰ

امیر کبیر شاہ ہمدانؒ تین مرتبہ سرینگر تشریف لائے تھے، پہلی دفعہ چھ ماہ قیام کرنے کے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے۔ ۱۳۷۹ء، ۷۸۱ھ میں یہاں دوبارہ آئے اور کوئی ڈھائی سال کا عرصہ گزرا۔ یہاں سے آپ لداخ کے راستے ترکستان چلے گئے۔ تیسری بار ۱۳۸۳ء میں کشمیر آئے لیکن خرابی صحت کے باعث زیادہ دیر قیام نہ فرما سکے۔ واپس تاجکستان جاتے ہوئے افغانستان کے مقام کنر میں ۱۸ جنوری ۱۳۸۵ء کو وفات پائی اور آپ کے جسد کو کولاب تاجکستان کے مقام پر دفنایا گیا۔ تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ ہمدان کا کشمیر میں قیام تقریباً چار سال تک رہا لیکن آپ ایک ایسی بڑی روحانی اور علمی شخصیت تھے کہ چھ صدیوں کے دوران آج تک اہل کشمیر آپ کی بلند مقام شخصیت سے اقتباس نور وہدایت کرتے چلے آئے ہیں۔ آپ نے اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کا عملی نمونہ پیش کیا۔ آپ نے شریعت اور طریقت میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی۔

حضرت شاہ ہمدان نے سرینگر میں ایک بیٹھک بنالی تھی جہاں عوام حاضر ہوتے اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے۔ بعد میں آپ کا یہ حجرہ خانقاہ معلیٰ کے نام سے مشہور ہوا اور اس حجرہ کی جگہ کشمیر کے سلطان سکندر نے ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کروائی۔ شہر اور اطراف سے لوگ جوق در جوق حاضر ہوتے اور فیض پا کر واپس چلے جاتے۔ اس خانقاہ نے مرکز تجلیات ہونے اعزاز حاصل کرلیا۔

خانقاہ معلیٰ ایک فقید المثال عمارت ہے۔ اس کی چھت بھوج پتر کی لکڑی اور اخروٹ کی لکڑی سے بنائی گئی ہے۔ اندرونی دیواریں مرصع ہیں اور ان دیواروں پر قرآن حکیم کی آیات کندہ کی گئی ہیں۔ سلطان سکندر نے اس خانقاہ کی تعمیر کا حکم ۱۳۹۴ء میں دیا یعنی شاہ ہمدان کی وفات کے ٹھیک دس سال بعد شروع ہوئی اور بائیس سال کے بعد ۱۴۱۷ء میں مکمل ہوئی۔

سلطان سکندر شاہ ہمدانؒ کا عقیدت مند تھا اس لیے وہ ذاتی طور پر خانقاہ کی تعمیر میں دلچسپی لیتا رہا۔ وہ اپنے ہاتھ سے مٹی اور اینٹیں ڈھوتا اور بعض اوقات لکڑی بھی تراشتا جو تعمیر میں استعمال

ہوتی۔ یہ خانقاہ ایک مسجد کی شکل میں ہے اور چوبی طرز تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس کی دیواروں کے نقش ونگار دیدنی ہیں۔ دیکھنے والا ان میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہ مرکز تجلیات حضرت شاہ ہمدانؒ کی زندگی میں ہی رشد و ہدایت کا مرکز بن گیا تھا، عقیدت مند جمعرات اور جمعہ کو یہاں خاص طور پر حاضری دیتے ہیں خانقاہ معلیٰ میں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے۔ اس مرکز تقدس میں پہنچ کر مجرم توبہ کر لیتے ہیں اور یہاں آ کر برسوں کی پرانی دشمنیاں بھول جاتے ہیں۔

وادی کشمیر میں تصوف کے مختلف سلسلوں سے وابستہ بزرگوں اور ان کے عقیدت مندوں نے سینکڑوں خانقاہیں تعمیر کروائی ہیں جہاں سے عوام کو دل کی صفائی اور آنکھوں کی روشنی ملتی ہے لیکن ان تمام خانقاہوں کی سرتاج خانقاہ معلیٰ سمجھی جاتی ہے جو اپنی قدامت، وسعت اور اثرات کی وجہ سے ممتاز ہے۔ خانقاہ معلیٰ کی تعمیر تقریباً چھ سو سال گزر گئے۔ اس طویل مدت میں درجنوں انقلاب آئے سینکڑوں بادشاہوں نے تاج پہنے، سماج میں تبدیلیاں آئیں، تہذیب وتمدن نے ارتقاء کے مرحلے طے کیے۔ سکھوں اور ڈوگروں نے مظالم کی انتہا کی۔ اسلامیان کشمیر نے غلامی اور بیچارگی کے ہزاروں مناظر دیکھے۔ بہار وخزاں آتی رہی۔ سلسلہ روز وشب جاری رہا لیکن زمانے کا کوئی انقلاب اور تاریخ کا کوئی جبر خانقاہ معلیٰ کی مقبولیت کو کم نہ کر سکا اور اس مرکز تجلیات کو مظالم کے سیاہ بادل چھپا نہ سکے کیونکہ یہاں ایک مرد درویش، ایک مومن اور ایک عارف نے قدم رکھا اور اپنے وجود سے مشرف کیا تھا۔ یہاں سید السادات نے قیام فرمایا تھا۔ سالار عجم نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ سلطانوں کے مشیر اور درویشوں کے غمگسار نے اس مقام پر بیٹھ کر اسلام کی بنیاد رکھی تھی، آپ بقول علامہ اقبال کشور کشمیر کے مرشد تھے اور آپ ہی نے کشمیر میں علم صنعت، تہذیب اور دین اسلام کو متعارف کروایا تھا:

مرشد آن کشور مینو نظیر
میرو درویش و سلاطین را مشیر
خطہ را آن شاہ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں

جامع مسجد سرینگر

سرینگر کی جامع مسجد وادی میں تعمیر ہونے والی اولین مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ زنیہ کدل کے قریب اس پرشکوہ مسجد کی تعمیر کا آغاز ۱۳۹۸ء میں سلطان سکندر نے کروایا تھا اور اس کی تکمیل ۱۴۰۲ء میں ہوئی۔ یہ مسجد حسن وخوبی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے تین دروازے ہیں۔ مغربی سمت میں شاہی دروازہ کھلتا ہے۔ صحن کے چاروں طرف چار بڑے بڑے دالان ہیں جن کی چھتیں چوبی ستونوں پر قائم ہیں۔ ایک مورخ ہرگوپال خستہ نے ان کی تعداد ۳۷۲ بتائی ہے۔ ہر دالان کے وسط میں ایک مینار ہے جو چار ستونوں پر ایستادہ ہے جن کی تعداد ۳۲ ہے۔ اس کے مرصع ستون کشمیر کے کاریگروں کا اعجاز ہے جو لکڑی پر نقش ونگار بنانے اور میناکاری میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ دیواریں چار فٹ چوڑی ہیں، محراب کے اندرونی حصہ میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء حسنیٰ لکھے گئے ہیں جو خوش خطی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مسجد کی چھت بھوج پتر کی لکڑی سے اور اندرونی حصہ اخروٹ کی لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ ان پر خوبصورت نقش ونگار اور پھول بوٹے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے صحن میں ایک وسیع خوبصورت حوض ہے۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی ۳۴ فٹ ہے۔

جامع مسجد سرینگر کئی بار حوادث زمانہ کا شکار ہوئی۔ ۸۸۵ھ میں اس کو آگ لگی مگر جلد ہی دوبارہ مرمت کر دی گئی۔ ۱۰۲۹ھ میں دوبارہ عیدالفطر کے دن آگ لگی اور اردگرد کے بارہ ہزار مکانات جل کر خاکستر ہو گئے۔ ان دنوں جہانگیر کشمیر میں ہی تھا۔ وہ آتش سوزی کا سن کر خود مسجد میں پہنچ گیا اور آگ بجھانے میں ذاتی طور پر حصہ لیا۔ آگ پر قابو پالیا گیا مگر جہانگیر چاہتا تھا کہ مسجد از سرنو تعمیر کی جائے۔ چنانچہ اس نے ملک حیدر چاڈورہ کو حکم دیا کہ یہ مسجد سنگ سیاہ سے دوبارہ تعمیر کی جائے، ملک چاڈورہ نے سترہ سال کی مدت میں لاکھوں روپے کے خرچ سے مسجد کی شان و شوکت بحال کر دی، نئی مسجد پر وہی مرصع کاری اور مینارکاری کروائی گئی جو پہلے تھی۔

اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں یعنی ۱۶۷۴ء میں مسجد کو تیسری بار آگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بادشاہ نے تعمیر جدید کا حکم دیا اور یہ حکم نامہ بھی جاری کیا کہ اردگرد کے تمام

مکانات گرادیئے جائیں۔ مسجد کی تعمیر کے لیے وسط ایشیا سے ماہر فن کار اور کاریگر بلائے گئے تھے۔ چنانچہ تعمیر میں تین سال لگے۔ میناروں پر چاندی کے کلس لگوائے گئے۔ مغلوں کے بعد کشمیر پر افغانوں کا قبضہ ہوا تو افغان گورنروں نے بھی مسجد کی حفاظت پر خاص توجہ دی اور تزئین و آرائش کا اہتمام کیا گیا۔

یہ جامع مسجد نور و ہدایت کا مرکز رہی لیکن افسوسناک واقعہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۰ء میں سکھوں کے عہد میں حکومت میں دیوان موتی رام نے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہوئے اس میں جلنے والی ساری قندیلیں گل کروا دیں اور مسجد کے دروازوں پر تالے لگوا دیئے۔ ۲۳ سال کی طویل مدت کے بعد شیخ غلام محی الدین کشمیر کا گورنر بنا تو اس نے مسجد کی تالہ بندی ختم کی۔ ۲۳ سال کی تالہ بندی کے دوران مسجد کا حسن جاتا رہا اور بعض حصے گرنے والے ہو گئے تھے۔ چنانچہ کشمیر کے مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے مسجد کی رونقیں دوبارہ بحال کر دیں۔ سکھوں کا دور بدترین دور تھا جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا:

جرم ما، مارا چو دامن گیر شد
قوم سنگاں وارد کشمیر شد

سکھوں کے بعد کشمیر پر ڈوگرہ خاندان کا قبضہ ہوا۔ اس دور میں بھی جامع مسجد کی حالت ناگفتہ رہی۔ مسلمانوں کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مسجد کی مرمت کے اخراجات برداشت کر سکتے۔ گلاب سنگھ کے دور حکومت میں صرف جمعہ کی نماز کے لیے دروازے کھولے جاتے تھے۔ ۱۸۶۰ء کے زمانے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں کشمیر کی ثروت مند شخصیات نے مسجد کے لیے چندہ جمع کر کے اس کی تعمیر کروائی۔ جمعہ کے روز جامع مسجد کے باہر نوہٹہ سے ہا کہ بازار تک بازار لگتا تھا جہاں سے شہری ہفتہ بھر کی اشیائے ضرورت خریدتے تھے۔ بعد میں مہاراج گنج بازار میں ایک جدید تجارتی منڈی قائم کر دی گئی۔ ۱۸۸۵ء میں ڈھاکہ کے نواب سر عبدالغنی نے مسجد کے لیے پانچ ہزار روپیہ دیا۔ ۱۹۰۵ء میں سر آغا خاں نے مسجد کی مرمت کے لیے رقم ارسال کی۔ وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے مسجد کی چھت پر چادریں ڈلوائیں۔ ۱۹۷۰ء میں مسجد کا انتظام ادارہ اوقاف اسلامیہ کے سپرد کر دیا گیا۔ پھر میر واعظ مولوی محمد فاروق شہید کی سرپرستی میں مسجد کے چاروں طرف چمن بندی کروائی گئی، مدرسہ قائم ہوا۔ سرینگر کی جامع مسجد مسلمانوں کا ایک روحانی، تہذیبی اور سیاسی و سماجی مرکز رہی ہے اور آج بھی ہے۔

اقبال اور کشمیر

حضرت علامہ اقبالؒ کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ یہ دعویٰ کرنے کے باوجود کہ گھر میرا نہ دلی نہ صفا ہاں نہ سمرقند۔ علامہ کو اپنے وطن مالوف سے ذہنی اور جذباتی لگاؤ ہمیشہ رہا۔ آپ جس طرح برصغیر کی آزادی اور قیام پاکستان کے لیے سرگرم عمل رہے۔ کشمیر کی آزادی اور ترقی وخوشحالی کے لیے بھی سعی فرماتے رہے۔

علامہ اپنے کشمیری الاصل ہونے پر فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

آپ نے کشمیر کے لیے ایران صغیر، کاشر، خطۂ گل، مینونظر جیسے نام اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں کشمیر کے مقامات لولاب، ہمالہ اور جھیل ولر کے نام بھی برتے ہیں۔ اقبال کے مورث اعلیٰ نے ترک وطن کے سیالکوٹ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ علامہ اقبال کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی مگر زندگی لاہور میں گزاری اور وہیں ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔ علامہ اقبال جب لاہور میں طالب علم تھے تو اسی زمانے میں یعنی ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری نے ''انجمن کشمیری مسلمانان لاہور'' کی داغ بیل ڈالی علامہ اس کے اجلاسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ کشمیر پر علامہ کی ایک نظم ۱۹۰۱ء کے ''کشمیری میگزین'' میں اور چند قطعات ۱۹۰۹ء کے ''کشمیری گزٹ'' میں شائع ہوئے، ایک مشہور قطعہ یوں ہے:

پنجہ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پرو بے بال کیا
توڑ اس دست جفاکیش کو یارب جس نے
روح آزادی کشمیر کو پامال کیا

۱۹۰۸ء میں علامہ کو "انجمن کشمیری مسلمانان لاہور" کا جنرل سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس انجمن کے پلیٹ فارم سے علامہ نے آواز اٹھائی کہ کشمیر کے مسلمانوں کو فوج میں لیا جائے اور ان کو زراعت پیشہ قرار دیا جائے۔

علامہ کو کشمیری مسلمانوں کی آزادی اور خوشحالی اور کشمیر کی تاریخ و ادب سے گہری دلچسپی رہی۔ آپ ۸ جون ۱۹۱۷ء کے خط میں محمد دین فوق کو لکھتے ہیں کہ کشمیر اور اہل کشمیر پر کتابیں لکھ کر مسلمانوں کے لٹریچر کو محفوظ کیا جائے۔ علامہ نے امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی تالیف "ذخیرۃ الملوک" سے بھرپور استفادہ کیا تھا، اس کے علاوہ مولانا انور شاہ کاشمیری سے ملاقات اور خط و کتابت کے ذریعے علمی استفادہ کرتے رہے، علامہ کشمیر کی جن شخصیات سے متاثر تھے ان میں سلطان شہاب الدین اور غنی کاشمیری کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال کو اپنا آبائی وطن دیکھنے کا بہت شوق تھا چنانچہ یورپ سے واپسی کے بعد آپ نے سب سے پہلے ۱۹۲۱ء میں کشمیر ہی کا سفر کیا۔

علامہ اقبال جون ۱۹۲۱ء میں ایک مقدمہ کی پیروی کرتے ہوئے سرینگر تشریف لے گئے۔ مولوی احمد دین ایڈووکیٹ اور منشی طاہر دین آپ کے ہمراہ تھے۔ یہ سفر علامہ نے راولپنڈی کوہالہ مظفر آباد کے راستے کیا تھا، اس زمانے میں الائیڈ چراغ دین اور نندہ بس سروس راولپنڈی سرینگر کے درمیان چلا کرتی تھی۔ آپ نے راولپنڈی سے بس کے ذریعے ہی سفر کیا تھا، علامہ ۱۰ جولائی کو واپس آئے۔ اس طرح دو ہفتے تک آپ کا قیام سرینگر میں رہا، اس دوران آپ نے اہل کشمیر کی غربت و مظلومی کو بچشم خود دیکھا، علامہ نے نشاط باغ، شالامار باغ اور نسیم باغ کی سیر کے علاوہ علاقہ لولاب کا دورہ بھی کیا۔ مشاہیر کشمیر بھی آپ سے ملاقات کرتے رہے۔

سرینگر میں قیام کے دوران علامہ نے فارسی میں تین اہم نظمیں کہیں جو "ساقی نامہ"، "کشمیر" اور "غنی کشمیر" کے عنوان سے "پیام مشرق" میں شائع ہوئیں۔

علامہ نے مشہور انقلابی نظم "ساقی نامہ" سرینگر کے نشاط باغ میں کہی۔ فرماتے ہیں دیکھتے نہیں ہو کہ کاشغر سے لے کر کاشان تک ہر خطہ سے آزادی کی آواز کا شعر بلند ہو رہا ہے:

نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشان

ہمان یک نوا بالد از ہر دیاری

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو جب کشمیر میں تحریک حریت کا آغاز ہوا اور ڈوگرہ حکومت نے تحریک چلانے والوں پر مظالم توڑنے شروع کیے تو علامہ لاہور میں اجتماعی جلسوں اور جلوسوں کی قیادت فرماتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں حضرت علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر رہے۔ علامہ کا فارسی شاہکار ''جاوید نامہ'' فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ آپ اس ذہنی سفر کے دوران جب آنسوآئے افلاک میں قدم رکھتے ہیں تو حضرت شاہ ہمدانؒ اور ملا طاہر غنی سے ملاقات فرماتے ہیں۔ شاہ ہمدان کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

خطہ را آن شاہ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دین

یعنی اس فیاض بادشاہ نے خطہ کشمیر کو علم، صنعت، تہذیب اور دین اسلام کا تحفہ دیا۔ ۱۸۴۶ء کے منحوس بیع نامہ امرتسر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس بیع نامہ کی رو سے کشمیر کے دہقان، کشمیر کے کھیت، کشمیر کی نہروں، کشمیر کے باغوں یہاں تک کہ پوری کشمیری قوم کا سودا کر دیا گیا اور وہ بھی بہت سستے داموں:

دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند
قومی فروختند و چہ ارزان فروختند

علامہ ۱۹۳۷ء کے موسم گرما میں کشمیر جانا چاہتے تھے لیکن اجازت نامہ دیر سے ملا اس لیے نہ جا سکے ''ارمغان حجاز'' مطبوعہ ۱۹۳۸ء میں علامہ کی سترہ نظمیں کشمیر پر ہیں۔ ان منظومات کے چند اشعار آپ بھی سن لیجیے:

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آب ولر کے تمام یکدانہ
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے
جس خاک کے خمیر میں ہے آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

قائداعظم کا سفر کشمیر

حضرت قائداعظم محمد علی جناح کشمیر اور اہل کشمیر سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ آپ نے خطہ کشمیر کے چار سفر فرمائے جو ذاتی بھی تھے اور سیاسی اہمیت کے حامل بھی۔ ہمارے قائد بیگم کے ہمراہ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں کشمیر تشریف لے گئے لیکن اس سفر کی تفصیل نہیں ملتی، دوسری مرتبہ آپ نے ۱۹۲۶ء میں کشمیر کا سفر کیا۔ اس دوران آپ نے کشمیر کی تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی و معاشرتی حالات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ تقریباً سترہ سال کے بعد آپ نے کشمیر کا تیسرا سفر ۱۹۳۶ء میں کیا۔ ان دنوں کشمیر میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ قائداعظم برصغیر کے ممتاز وکیل تھے چنانچہ اس دفعہ آپ کو دو مقدموں کی پیروی کے لیے بلایا گیا تھا۔ آپ نے ان مقدمات کی فیس میں جو رقم وصول کی وہ سرینگر کی معروف تعلیمی اور سماجی تنظیم انجمن ''نصرت الاسلام'' کو عنایت کر دی تھی۔ چوتھی اور آخری بار قائداعظم ۸ مئی ۱۹۴۴ء کشمیر کے سیاسی سفر پر نکلے اور سوچیت گڑھ کے راستے جموں تشریف لائے۔ اس بار کشمیر میں آپ کا قیام اڑھائی مہینے تک رہا۔ اس سال آپ کسی مقدمے کے لیے نہیں بلکہ ملت کی رہنمائی کے لیے آئے تھے۔ آپ کو کشمیر کا دورہ کرنے کی دعوت کشمیر کی دو بڑی جماعتوں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس کے علاوہ مسلم سٹوڈنٹس یونین نے دی تھی۔ اس سے پہلے ۱۹۴۳ء میں نیشنل کانفرنس کے سیکرٹری جنرل مولوی سعید مسعودی دہلی میں جا کر قائد کو دورہ کشمیر کی دعوت دے چکے تھے۔ یکم اپریل ۱۹۴۴ء کو چوہدری غلام عباس نے لاہور میں قائد کی خدمت میں حاضر ہو کر دعوت دی تھی۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں شیخ محمد عبداللہ نے لاہور میں ہی آپ کو دعوت دی کہ آپ کشمیر آ کر ملت کشمیر کی رہنمائی اور قیادت فرمائیں۔ ۸ مئی کو قائد اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح کے ہمراہ سیالکوٹ پہنچے۔ وہاں سے جموں گئے اور رات کو قیام فرمایا۔ اہل جموں نے آپ کا زبردست استقبال کیا۔ عیدگاہ میں عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ قائد نے سپاسنامہ کے جواب میں ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ ۹ مئی کو آپ سرینگر

کے لیے روانہ ہوئے۔ رات بانہال کے ریسٹ ہاؤس میں بسر کی۔ ۱۰ مئی کو سرینگر میں سیاسی جماعتوں نے استقبال کیا۔ نیشنل کانفرنس کی طرف سے استقبالیہ اجلاس ہوا اور مسلم کانفرنس کے استقبالیہ میں میر واعظ مولانا یوسف شاہ نے سپاس نامہ پیش کیا۔ سرینگر میں حضرت قائد سر مراتب علی کے بنگلے کوننک اور ''کوئین الزبیتھ'' نامی ہاؤس بوٹ میں قیام فرمایا۔ میر واعظ نے قائداعظم کے اعزاز میں ایک بڑی ضیافت دی اور کشمیری شال کا تحفہ پیش کیا۔ قائداعظم نے خوش ہو کر فرمایا ''لو آج تو میں بھی کشمیری ہو گیا ہوں۔''

۱۷ جون ۱۹۴۴ء کو قائداعظم نے مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی، قائداعظم کشمیر کے ڈوگرہ راجہ ہری سنگھ سے ملاقات کر کے سیاسی حالات پر گفتگو کرنا چاہتے تھے مگر یہ ظالم راجہ اس سعادت سے محروم رہا۔ انہی دنوں سرینگر کا ایک ہونہار اور ذہین طالب علم قائداعظم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ آپ نے اسے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنالیا اور اس نوجوان نے تحریک پاکستان اور آزادی کشمیر میں تاریخی رول ادا کیا۔ یہ باکمال نوجوان بعد میں کے۔ ایچ خورشید کے نام سے خورشید کی طرح چمکا۔ تقریباً دو ماہ سترہ دن کشمیر میں قیام کرنے کے بعد قائداعظم نے واپسی کا سفر براستہ مظفرآباد شروع کیا۔ فاطمہ جناح اور چوہدری غلام عباس آپ کے ہمراہ تھے۔ راستے میں جگہ جگہ آپ کا استقبال کیا گیا۔ بارہ مولہ میں خواجہ غلام دین وانی، سوپور میں خواجہ غلام محی الدین اوڑی میں میرے استاد محترم پروفیسر حکیم مولانا محمد ایوب انصاری نے اور مظفرآباد میں خواجہ غلام قادر نے اہلیان شہر کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا۔ ایک رات آپ نے دو میل کے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ شیخ سعید احمد نے عشائیہ دیا۔ دوسرے دن قائداعظم نے اپنی طرف سے عمائدین شہر کو ظہرانہ دیا۔ اسی روز آپ راولپنڈی کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے اس دورہ نے تحریک آزادی کشمیر میں نئی روح ڈال دی اور آپ دم واپسیں تک آزادی کشمیر کے لیے سوچتے رہے۔ آپ فی الواقع وہ میر کارواں تھے جس کی تعریف اقبال نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

کشمیر کی چند فلاحی اور سیاسی تحریکیں

سعید اسعد کی تحقیق کے مطابق ڈوگروں کے دور میں جموں وکشمیر میں مسلمانوں کا تناسب ۸۵ فیصد بنتا تھا لیکن ڈوگرے ان کے سیاسی، معاشی اور مذہبی حقوق دینے پر تیار نہ تھے۔ مسلمانوں کو یہ آزادی نہ تھی کہ وہ کوئی سیاسی تحریک چلاتے یا جماعت بناتے۔ ان حالات میں انہوں نے مختلف وقتوں میں چھوٹی چھوٹی اصلاحی انجمنیں بنائیں اور ان کے ذریعے ملت کو بیدار او رمنظم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۸۹۲ء میں جموں میں انجمن اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ انجمن نے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اس انجمن کا رول نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۹۶ء میں لاہور میں انجمن کشمیری مسلمانان لاہور قائم ہوئی۔ پنجاب میں کشمیر سے ترک سکونت کر کے آنے والوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یہ مہاجرین زیادہ تر لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور امرتسر میں رہائش پذیر تھے، اس انجمن کے پہلے صدر میاں کریم بخش اور سیکرٹری جنرل علامہ اقبال تھے۔ آپ اس انجمن میں کشمیر سے متعلق کلام بھی سنایا کرتے تھے، اقبال کی نظم کا یہ شعر قابل داد ہے:

ہزار شکر ہے کہ ایک انجمن ہوئی قائم
یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالع واژوں

۱۸۹۷ء میں سرینگر میں انجمن ''نصرت الاسلام'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کی بنیاد میر واعظ رسول شاہ نے رکھی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ وادی کے مسلمانوں میں تعلیم کو عام کیا جائے۔ اس انجمن نے متعدد سکول اور مکتب کھولے۔

لاہور کے کشمیریوں نے ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے نام سے ایک اصلاحی اور نیم سیاسی ادارہ قائم کیا۔ اس کانفرنس کے قیام میں علامہ اقبال، محمد دین فوق اور چند دیگر حضرات نے حصہ لیا تھا، علامہ اقبال کو اس کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ باشندگان

کشمیر کو حصول تعلیم کی طرف قائل کیا جائے اور سیاسی و معاشرتی حقوق دلائے جائیں۔ اس تنظیم نے پنجاب میں بسنے والے کشمیریوں کی فکری سطح پر بڑی رہنمائی کی اور شعور بیدار کیا۔

۱۹۰۹ء میں جموں میں ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا، اس کے بانیوں میں جموں کے مشاہیر تھے۔ ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد میں برے رسوم کا خاتمہ، تعلیم عام کرنا اور اردو کی ترقی شامل تھی، ۱۹۲۳ء میں اس تنظیم کو دوبارہ منظم کیا گیا اور اب مسلمانوں کے تعلیمی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کو بھی شامل کر لیا گیا۔

۱۹۱۱ء میں شہر پونچھ میں انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی گئی، انجمن اسلامیہ کا رول تعلیم کو عام کرنے اور سیاسی شعور بیدار کرنے میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

۱۹۳۰ء میں سرینگر میں علی گڑھ کے چند تعلیم یافتہ جوانوں نے ریڈنگ روم پارٹی کے نام سے ایک فلاحی انجمن قائم کی۔ ابتداء میں اس انجمن کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں میں اخبار بینی او ر کتاب خوانی کا شوق پیدا کیا جائے بعد میں ریڈنگ روم میں آنے والے لوگ اور بالعموم نوجوان طبقہ سیاسی و انتظامی حالات پر گفتگو کرنے لگے اس ریڈنگ روم نے دھیرے دھیرے نوجوانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ یہ ریڈنگ روم بعد میں ایک سیاسی تنظیم کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔

۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی جیسے اکابر ملت نے اس کے ابتدائی اجلاس میں شرکت کی۔ دو برس کے عرصے میں کشمیر کمیٹی نے مقبولیت حاصل کر لی۔ کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو علامہ اقبال کو اس کا صدر اور ملک برکت علی ایڈووکیٹ کو جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر کانفرنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ کانفرنس کے جنرل سیکرٹری چوہدری غلام عباس منتخب ہوئے۔ مسلم کانفرنس کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ مسلمانان جموں و کشمیر کو منظم کیا جائے۔ ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جائے ان کی سیاسی، معاشرتی اور تمدنی اصلاح کی جائے۔ یہ جماعت آج بھی ملک کی تعمیر و ترقی اور آزادی کے لیے سرگرم عمل ہے اور اس نے سواد اعظم کو ایک پرچم تلے متحد رکھا ہوا ہے۔

کشمیر کے چشمے

کشمیر وادی آبشاروں، جھیلوں، ندیوں، نہروں اور چشموں کی سرزمین ہے۔ آج کی گفتگو میں ہم کشمیر کے اہم چشموں کا ذکر کریں گے۔ کشمیر پر لکھنے والوں نے کوئی دو درجن سے زیادہ چشموں کی تفصیل دی ہے۔ ہم یہاں مختصراً ان کا ذکر کرتے ہیں۔

چشمہ اچھہ بل مشہور چشمہ ہے۔ اننت ناگ سے چھ میل دور جنوب مغرب میں ہے اور دامن کوہ میں واقع ہے۔ یہ راجہ اچھہ کے نام پر مشہور ہوا۔ شاہجہان نے اس چشمہ کے اردگرد پختہ چاردیواری تعمیر کروادی تھی۔ اس چشمے سے ابلنے والا پانی) برنگی ندی سے آتا ہے۔ چشمہ کے چاروں طرف چنار کے پرانے درخت ہیں۔ اس چشمہ سے دس میل دور چشمہ ککرناگ ہے اور پانی سے ہر وقت لبالب رہتا ہے۔ یہاں کی آب وہوا روح پرور ہے۔ سیاح اس کے گرد خیمہ لگا کر قیام کرتے ہیں۔

چشمہ کھر بھوانی گاندربل سے ۳ میل دور جنوب مغرب کی سمت واقع ہے۔ ہندو یہاں مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ چشمہ کے اردگرد سرو کے درخت قطار در قطار ایستادہ ہیں۔ اس کے بعد چناروں کے درخت صف در صف کھڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چنار سلطان بڈھ شاہ اور سرو شاہجہان کے زمانے کے ہیں۔

چشمہ شاہی میراک دل سے ۵ میل دور سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اس کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا:

چشمہ شاہی کا منظر رشک فردوس بریں
سلسبیل و کوثر و تسنیم سے بڑھ کر حسیں

اس کے اردگرد باغات ہیں۔ ایک فارسی شاعر کا یہ شعر سماعت فرمائیے:

چشمہ کوثر اگر خواہی کہ آید در نظر
لطفِ آب خوشگوار چشمہ شاہی نگر

اس چشمہ کے تین طبقے ہیں۔ درمیان میں سنگ سرخ سے راستہ تراشا گیا ہے۔ یہ مغلیہ دور سے قدیم تر چشمہ ہے۔ چشمہ کے اوپر عمارت شاہجہان کے حکم سے صوبیدار کشمیر مردان خان نے ۱۰۴۳ء میں تعمیر کروائی تھی۔ کوثر شاہی سے مادہ تاریخ نکلتا ہے:

گفتمش بہر چشمہ ای تاریخ

گفت بر گو کہ کوثر شاہی

چشمہ ویری ناگ وادی کا مشہور چشمہ ہے۔ اننت ناگ سے ۱۶ میل دور بانہال کے دامن میں واقع ہے، ایک سو ایک فٹ مدور اور پچاس فٹ گہرا ہے۔ اس کی مچھلی دور دور تک مشہور ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک پختہ فصیل بنی ہوئی ہے۔ اندرونی حصے کے تین طبقے ہیں۔ اس چشمہ سے ایک نہر نکلتی ہے جو کبھی اردگرد کے باغات کو سیراب کرتی تھی۔ چشمہ کی عمارات شاہجہان نے بنوائی تھیں اس کے گرد ۲۴ محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ سال تعمیر کا مادہ تاریخ قصر آباد چشمہ ورناگ ۱۰۲۹ء نکلتا ہے۔ اردگرد پھلدار درختوں کے باغات ہیں۔

چشمہ اندھ ناگ کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی مچھلیاں اندھی ہوتی ہیں۔ جہانگیر خودنوشت میں لکھتا ہے میں نے جال ڈلوایا بارہ مچھلیاں جال میں آئیں، تین اندھی اور نو آنکھوں والی تھیں۔ چشمہ تری سندھیا مشہور ہے۔ سال میں صرف دو ماہ پانی سے بھرتا ہے، پانی اندر ہی اندر کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ ایک اور چشمہ رودر سیندھیا ہے جو دن میں گیارہ بار خشک ہو کر گیارہ مرتبہ پانی سے بھر جاتا ہے۔ یون سندھیا شاہ آباد میں ہے دن میں تین بار خشک اور تین بار بھرتا ہے۔ ہا کرہ سر کا چشمہ ہوا چلتی ہے تو بھر جاتا ہے ورنہ خشک پڑا رہتا ہے۔

جہانگیر نے سرینگر کے گرد و نواح میں جن چشموں کا ذکر کیا ہے ستھا بھولی کا نام بھی آتا ہے۔ ستھا بھولی کے معنی سات چشموں کے ہیں۔ یہ چشمے نندی مرگ سے نکلتے ہیں۔ سوندھ براری ایسا چشمہ ہے کہ مئی میں برف پگھلنے لگتی ہے تو پندرہ روز تک فوارے کی طرح جاری رہتا ہے۔ شب و روز میں تین بار طلوع آفتاب کے وقت، دوپہر اور رات کو بند ہو جاتا ہے۔ عالمگیری دور کا سیاح برنیئر یہاں چھ دن قیام پذیر رہا اور تحقیقات سے ثابت کیا کہ یہ کہانی صحیح نہیں ہے، خلاصہ یہ ہے کہ کشمیر میں چشموں کی کوئی کمی نہیں اور ان سے متعلق روایات بھی بہت ہیں۔

کشمیر کی جھلیں

وادیوں اور دروں میں چشموں، بارشوں اور برفوں کا وسیع رقبے میں جو پانی جمع ہو جاتا ہے اسے انگریزی میں LAKE فارسی میں دریاچہ اور اردو میں جھیل کہتے ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں گہری وادیوں کی کمی نہیں ہے۔ یہاں قدرتی چشموں اور گلیشیر کی فراوانی ہے لہٰذا قدرتی طور پر اس خطہ گل ولالہ میں جھیلیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ہم اس وقت کشمیر جموں اور آزاد کشمیر کی چند ایک مشہور جھیلوں کا ذکر کریں گے۔

سرینگر سے ۲۲ کلومیٹر کے فاصلے پر سنگرام کے مقام پر جھیل ولر پائی جاتی ہے جو کشمیر کی سب سے بڑی اور ایشیا میں میٹھے پانی کی معروف جھیل ہے، اس کی لمبائی ۳۰ کلومیٹر اور چوڑائی ۱۴ کلومیٹر ہے، دریائے جہلم اس جھیل کے درمیان میں سے گزرتا ہے۔ اس کا قدیم نام مہاپدم سر ہے۔ ولر کے بارے میں یہ کہانی مشہور ہے کہ اس کے مقام پر ایک شہر آباد تھا جو لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ شہر کے کھنڈرات ولر میں آج بھی موجود ہیں۔ علامہ اقبال نے ولر کو استعارے کے طور پر ان اشعار میں استعمال کیا ہے:

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گہر ہیں آب ولر کے تمام یکدانہ

○

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

جھیل ڈل تخت سلیمان کے دامن میں واقع ہے اور یہ کوہ ماران سے سرینگر تک پھیلی ہوئی ہے۔ ڈل کی لمبائی شمالاً جنوباً ۵ میل اور چوڑائی شرقاً غرباً ۲ میل ہے۔ سرینگر کے نزدیک یہ جھیل دریائے جہلم میں گرتی ہے۔

جھیل نگین ڈل کے ساتھ متصل ہے۔ یہ جھیل چونکہ انگوٹھی میں نگینے کی طرح چمکتی ہے اسی لیے اسے نگین کا نام دیا گیا ہے۔ جھیل مانس بل سرینگر سے ۱۸ میل دور وادی سندھ میں واقع ہے۔ یہ سیاحوں کی پسندیدہ جھیل ہے اور چاروں طرف پہاڑ ہیں۔ پانی بے حد شفاف ہے جس میں کنول کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں، گہرائی ۴۷ فٹ بتائی جاتی ہے۔

جھیل آنچار سرینگر سے ۶ میل دور واقع ہے۔ یہ جھیل بڈھ شاہ نے تعمیر کروائی تھی اس میں مچھلی بکثرت پائی جاتی ہے۔ یہ پہلگام سے امرناتھ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں برفانی جھیل شیش ناگ پڑتی ہے، یہ سطح سمندر سے ۱۱۷۳۰ فٹ اونچی ہے اور اس کی تہہ میں سبز رنگ کی ریت ہے۔

جھیل کونسر ناگ شوپیاں سے ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر سلسلہ پنجال میں واقع ہے۔ یہ کشمیر کی سب سے بلند اور گہری جھیل ہے، طول ۲ میل اور عرض ڈیڑھ میل ہے۔ سطح سمندر سے ۱۵ ہزار فٹ بلند ہے اور جون تک منجمد رہتی ہے۔ موسم گرما میں برف پگھلتی ہے مگر پھر بھی برف کے ٹکڑے سطح آب پر تیرتے رہتے ہیں۔

جھیل ہوکر سرینگر سے ۱۱ کلومیٹر دور ہے۔ اس کے کنارے خربوزہ، تربوز اور کھیرا بکثرت پیدا ہوتا ہے، کوہ ہرمکھ کی چوٹی پر جو جھیل واقع ہے اس کا نام جھیل گنگا جل ہے، یہاں ہر سال اگست کے مہینے میں میلہ لگتا ہے۔ جھیل تارسر مارسر اصل میں دو جھیلیں ہیں جو امرناتھ غار کے نزدیک واقع ہیں، ان جھیلوں کا پانی سرینگر شہر میں سپلائی ہوتا ہے، جھیل مانسر صوبہ جموں کی مشہور جھیل ہے جو سانبہ کے مقام پر واقع ہے۔ اس کے اردگرد آم کے باغات ہیں۔ جھیل سناسر ایک سیاحتی مقام بٹوٹ کی پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کی بلندی ۶۸۰۰ فٹ ہے۔ جموں شہر یہاں سے ۱۲۹ کلومیٹر ہے۔ جھیل سرن سر یہ جھیل راجوری کی درہال وادی میں واقع ہے۔ سلسلہ پیر پنجال میں ایک جھیل موجود ہے جسے چنن سر کہا جاتا ہے۔ سلسلہ پیر پنجال ہی میں ایک اور جھیل واقع ہے۔ اس کا پانی سیاہ رنگ کا ہے اور اس بارے میں بہت سی دیو مالائی کہانیاں مشہور ہیں۔ کشمیر اور جموں کی جھیلوں کا حال بیان کر کے اب ہم ان جھیلوں کا ذکر کریں گے جو آزاد کشمیر میں پائی جاتی ہیں۔ منگلا جھیل ایک مصنوعی جھیل ہے یہ میرپور آزاد کشمیر کے نزدیک دریائے جہلم پر بند باندھ کر بنائی گئی ہے، ا س کا رقبہ ۴۰۰ مربع کلومیٹر ہے۔ منگلا جھیل پر جو بجلی گھر تعمیر کیا گیا ہے اس سے ایک ہزار میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے جو پاکستان کی ۳۵ فیصد ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

رتی گلی جھیل، یہ جھیل مظفر آباد سے ۸۰ کلومیٹر دور ہے اور وادی نیلم کے مقام دواریاں کے نزدیک واقع ہے۔ یہ ایک لمبی جھیل ہے اور یہ سطح سمندر سے ۱۵ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

آزاد کشمیر میں ساہنی کے مقام پر باغ سر جھیل اور راولاکوٹ کے قریب بنجوسہ جھیل مشہور سیاحتی مقامات ہیں۔ موسم گرما میں یہاں سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

جھیل ڈل

ماہرین ارضیات کی تحقیق کے مطابق قدیم دور میں کشمیر کی وادی ایک بڑی جھیل کی صورت میں تھی۔ اس جھیل کو چہار اطراف سے اونچے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا، یہ پہاڑیاں سال بھر برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ جھیل ڈل کا پرانا نام ستی سر ہے۔ ''راج ترنگنی'' کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ جھیل بارہ مولہ کے قریب ایک شگاف پڑنے سے بہنے لگی اور پھر وادی خشک ہوگئی مگر بے شمار چھوٹی چھوٹی جھیلیں باقی رہیں، چشموں، نہروں اور آبشاروں کے سبب کشمیر کی وادی بہت زرخیز ہے۔ آبی وسائل اس قدر ہیں کہ ان سے اتنی پن بجلی پیدا ہوسکتی ہے جو کشمیر کی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے، ''کشمیر کی دس جھیلیں'' کا مولف ایس این در لکھتا ہے کہ کشمیر اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کی طرح جھیلوں کی سرزمین ہے۔

کشمیر میں آنے والا ہر سیاح جھیل ڈل کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے، اس جھیل کو لارنس نے ''دی ویلی آف کشمیر'' میں ایک حسین ترین مقام قرار دیا ہے۔ ایک مضمون نگار کے بقول چاندنی رات میں جھیل ڈل کا نظارہ انسان کو ایک طلسمی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ اس جھیل کا پانی اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ رات کی چاندنی میں اردگرد کے پہاڑ اور درخت تیرتے نظر آتے ہیں۔ اس منظر طلوع اور غروب آفتاب کے وقت جھیل ڈل کا منظر بے حد خوبصورت اور دلکش ہوتا ہے۔

علامہ اقبال نے جھیل ڈل کے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

کوہ و دریا و غروب آفتاب
من خدارا دیدم آنجا بے حجاب

پہاڑ، دریا اور سورج غروب ہونے کا منظر ایسا ہے کہ مجھے یہاں خدا کا دیدار ہوگیا۔ کشمیری، فارسی اور اردو کے درجنوں شعراء نے ڈل کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

ہنگام صبح دیکھ بہار سرینگر
پانی ہے ڈل کا آئینہ دار سرینگر

یہ بتانا ضروری ہے کہ ڈل کی جھیل کی وسعت چار میل ہے اور یہ سرینگر شہر کے نزدیک ہے۔ جی ایم میر لکھتے ہیں: جھیل ڈل میں ہر وقت سیر و تفریح کے لیے خوبصورت، آرام دہ اور سجی سجائی

کشتیاں ہزاروں کی تعداد میں موجود رہتی ہیں، ان کشتیوں کو شکارہ کہتے ہیں۔ ان شکاروں کے نام الگ الگ ہوتے ہیں مثلاً گولڈن کوئین، سی برڈ نیلم وغیرہ۔ اس جھیل میں خوبصورت ہاؤس بوٹ قطار در قطار ہوتے ہیں جو ہوٹلوں کا کام دیتے ہیں۔ ہاؤس پانی میں تیرتے رہتے ہیں جنھیں ہاؤس بوٹ کہا جاتا ہے، ڈل جھیل تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ڈل کلاں جو حضرت بل کے سامنے ہے۔ ڈل خورد جس کا احاطہ کوہ سلیمان سے لے کر نشاط باغ تک ہے۔ تیسرا حصہ سدرہ کھورن کہلاتا ہے جو کوہ ماراں کے نیچے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بڈھ شاہ نے ڈل کلاں کے درمیان ایک مصنوعی جزیرہ سونہ لانک کے نام سے بنوایا تھا اور اس پر ایک خوبصورت محل تعمیر کروایا تھا، شہنشاہ اکبر نے دوبارہ سونہ لانک کے کھنڈرات پر ایک محل بنوا دیا تھا۔

جھیل ڈل کے کنارے پر کئی باغات ہیں جو بیرون کشمیر بھی مشہور ہیں مثلاً نشاط باغ، نسیم باغ، شالیمار باغ۔ کشمیر کے عظیم شاعر حضرت غلام احمد مہجور کی وہ کشمیری نظم بے حد مشہور ہوئی جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے باغ نشاط کے گلو ناز کران ولو۔

علامہ اقبال جب ۱۹۲۱ء میں کشمیر تشریف لے گئے تو آپ نے بھی ایک فارسی نظم باغ نشاط میں بیٹھ کر کہی تھی جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

خوشا روز گا رے خوشا نو بہارے
نجوم پرن رست از مرغزارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگا ہے
نہ در سینۂ اودل بے قرارے
آزاں مے فشاں قطرہ ای بر کشیری
کہ خاکسترش آفرنید شرارے

یہ ایام اور یہ نو بہار کس قدر خوب ہے کہ مرغزاروں میں ستارے اگے ہوئے ہیں۔ کشمیری قوم کی آنکھوں میں نظر کی چمک نہیں ہے اور ان کے سینوں میں بے قرار دل نہیں ہے۔ اے خدا کشمیری قوم پر وہی شراب انڈھیل تا کہ اس کی خاک سے شرارے پیدا ہوں۔ جھیل ڈل کے کنارے دو جزیرے بنائے گئے ہیں جو لانک اور روپا لنک کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ڈل میں ایک پارک بھی تعمیر ہوا ہے جہاں گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت خوب رونق اور گہما گہمی

رہتی ہے۔جھیل کے کنارے زیارت گاہ حضرت بل صدیوں پہلے تعمیر ہوئی جس میں سرور کائنات نبی اکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک تشریف فرما ہے۔موئے مبارک کی زیارت ہر جمعہ کو کرائی جاتی ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں مسلمان مرد و زن نہایت عقیدت و احترام سے حاضری دیتے ہیں۔جھیل ڈل میں تیرتے ہوئے کھیت ہیں۔شدید سردی میں ڈل کا پانی جم کر ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کی سطح پر شوقین لوگ فٹ بال اور کرکٹ کھیلتے ہیں۔جھیل کے پانی میں آبی پودے اور جانور بکثرت ہیں۔کنول کے پھول تو اور بہار دکھاتے ہیں۔اقبال نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:

من خدارا دیدم آنجا بے حجاب

کشمیر کے چند دریا

ریاست جموں وکشمیر دریاؤں، آبشاروں، جھرنوں، جھیلوں اور قدرتی چشموں کی سرزمین ہے۔ یہ خصوصیت اس خطہ ارض کو دنیا کے ممالک میں ایک ممتاز مقام دلاتی ہے۔ آج کی گفتگو میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ جموں وکشمیر کے آٹھ اہم دریاؤں کا مختصر سا تعارف کرادیں۔ کشمیر میں آٹھ بڑے اور چھتیس چھوٹے دریا رواں دواں ہیں۔ یہ دریا جہاں انسانوں، جانوروں او رنباتات کو زندگی عطا کرتے ہیں وہاں ان سے بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے۔ چنانچہ پاکستان میں استعمال ہونے والی اسی فیصد بجلی دریائے جہلم اور دریائے سندھ سے حاصل کی جاتی ہے۔ پہلے ہم دریائے سندھ کو لیتے ہیں یہ کشمیر کا سب سے بڑا دریا ہے۔ لداخ کی وادی سندھ کی نسبت سے اس دریا کو دریائے سندھ کہا جاتا ہے۔ اسے انگریزی میں انڈس اور سنسکرت میں سندھو اور لاطینی میں سندھس کہا جاتا ہے۔ ناموں کی یہ کثرت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ مشہور دریاؤں میں ایک ہے۔ دریائے سندھ ۱۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر بہتا ہے اور یہ گلگت سے ہوتا ہوا صوبہ سرحد میں داخل ہوتا ہے۔ چنانچہ تربیلا کے مقام پر ایک عظیم ڈیم بنایا گیا ہے۔ اٹک کے قریب دریائے کابل اس میں مل جاتا ہے۔ گدو بیراج، سکھر بیراج اور غلام محمد بیراج دریائے سندھ پر ہی بنائے گئے ہیں۔ سعید اسعد کی تحقیق کے مطابق دریائے سندھ سے پاکستان کا ایک کروڑ پچیس لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب کیا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کراچی کے مقام پر بحیرہ عرب میں شامل ہوجاتا ہے اور یوں میرے اس شعر کی تفسیر بن جاتا ہے:

دریا تو سبھی ملتے ہیں اک بحر میں صابر
منزل ہے وہی گرچہ کئی ایک ہیں راہیں
(صابر آفاقی)

دریائے شیوک لداخ کے شمال میں شیوک ڈیم سے نکلتا ہے۔ یہ شیوک اور خپلو سے گزرتا ہوا کرس کے مقام پر دریائے سندھ میں ملتا ہے، اس کی متعدد معاون ندیاں ہیں۔ دریائے گلگت

شمالی علاقہ جات کا اہم دریا ہے۔ گلگت کے نزدیک یہ دریائے سندھ میں ملتا ہے۔ اس کی معاون ندیاں بہت ہیں۔ دریائے نیلم اس کا پرانا نام کشن گنگا ہے، یہ دراس کی پہاڑیوں میں اشنہ سر نامی جھیل سے نکلتا ہے اور تاؤبٹ کے مقام پر آزاد کشمیر کی حدود میں داخل ہوتا ہے اور جنوب کی طرف بہتا ہوا مظفر آباد کے نزدیک دومیل کے مقام پر دریائے جہلم میں شامل ہوتا ہے۔ یہ سارا سفر پہاڑی سلسلوں اور وادیوں کا ہے، اس کا بہاؤ بے حد تیز ہے اور چونکہ سطح زمین سے نیچے بہتا ہے اس لیے کھیتوں کو سیراب نہیں کر سکتا۔ مظفر آباد شہر کو پینے کا پانی یہی دریا مہیا کرتا ہے۔ دریائے جہلم کا پرانا نام وتستا ہے۔ یہ کشمیر کے چشمہ ویری ناگ سے نکلتا ہے جو سطح سمندر سے ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر بہتا ہے۔ اس کی گزرگاہ میں اوڑی، مظفر آباد، کوہالہ اور میرپور آتے ہیں۔ پاکستان کے شہر جہلم، پنڈ دادن خان، بھیرہ اور خوشاب اس کی گزرگاہوں کے کنارے واقع ہیں، میرپور میں منگلا کے مقام پر اس سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ ۱۰۰۰ میگاواٹ کی یہ بجلی پاکستان کی ۳۵ فیصد ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ دریائے پونچھ سلسلہ پیر پنجال کی نیل کنٹھ گلی سے نکلتا ہے۔ شہر پونچھ، تتہ پانی اور کوٹلی اس کی گزرگاہ کے نزدیک واقع ہوئے ہیں۔ ڈڈیال کے نزدیک یہ دریا منگلا ڈیم میں گرتا ہے۔

دریائے چناب ہماچل کے علاقہ لاہول کی چندرا ندی اور بھاگا ندی سے نکلتا ہے۔ اس کا ایک نام دریائے چندر بھاگا بھی ہے، یہ شمال کا رخ اختیار کر کے ضلع ڈوڈہ میں ارتھل کے مقام پر پہنچ کر ریاست میں داخل ہوتا ہے اور اکھنور کے مقام پر پاکستان میں بہتا ہے پھر پنجاب میں ہیڈ مرالہ کے مقام پر دریائے تومی اور چناب اس سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ اس دریا پر ریاسی کے مقام پر سلال ڈیم تعمیر کیا گیا ہے۔ پاکستان کے مرالہ کے مقام پر اس سے نہر اپر چناب نکالی گئی ہے۔ چناب پنجاب کے پانچ دریاؤں میں شمار ہوتا ہے دریائے راوی کو سنسکرت میں ایراوتی کہتے ہیں۔ یہ دریا ضلع کانگڑہ کے علاقے کلو کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے۔ اور کٹھوعہ سے ہوتا ہوا پنجاب میں داخل ہوتا ہے۔ احمد پور کے نزدیک یہ دریائے چناب میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ چند ایسے دریا ہیں جو پاکستان کی معیشت کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں اور کشمیر و پاکستان کے فطری اتحاد کا ایک ایسا ثبوت ہیں جس پر تاریخ نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

کشمیر کے باغات

ڈاکٹر ایم۔ ایس ناز تحریر کرتے ہیں، کشمیر کا کوئی گھر ایسا نہیں جس میں باغ نہ ہو، باغ نہیں تو وہ باغ نما ضرور ہوگا۔ پہلو بہ پہلو سبزے کی کیاریوں میں نیلے پیلے، سرخ وسفید، گلابی، پیازی، کاسنی اور نہ جانے کن کن رنگوں کے پھول مہک رہے ہوں گے۔ باغوں کے تختوں کا ایک روپ مرغزار ہیں۔ مرغزار دراصل پہاڑوں کی چوٹیوں اور دروں میں واقع وہ میدان ہیں جو قدرت کے گونہ گوں گل ہائے معطر سے آراستہ ہیں۔ کشمیر کے تاریخی مرغزار یہ ہیں سونا مرگ، زجہ مرگ، نندی سر مرگ، نندی مرگ، چندن گوکل مرگ اور توسر مرگ وغیرہ کشمیر کے مرغزار شمار سے باہر ہیں۔ اسی طرح وادی کشمیر کے باغات کا شمار بھی آسان نہیں، دراصل کشمیر کا حسن ہی باغات سے ہے یہ باغات سلاطین تیموریہ کے ذوق جمالیات اور شوق تعمیرات کا نمونہ ہیں۔

کشمیر کے بعض باغات دست بردِ زمانہ کا شکار ہو چکے ہیں لیکن جن کو گردش فلک ویران نہیں کر سکی ان میں نشاط باغ، شالامار باغ، حضوری باغ، کوٹھی باغ، منشی باغ، داروغہ باغ، داراشکوہ باغ اور پری محل باغ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ نسیم باغ اکبر کے غلام نسیم خان کی نگرانی میں تعمیر ہوا اسی لیے اس کا نام نسیم باغ مشہور ہوا۔ نسیم باغ اکبر نے کشمیر کو فتح کرنے کے بعد تعمیر کروایا تھا۔ جھیل ڈل کے کنارے کنارے دریا کی سیر کا لطف اٹھانے کے لیے یہ باغ تیار کروایا۔ جہانگیر بھی اس باغ کا دلدادہ تھا لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب یہ باغ زمانے کی آندھیوں نے ویران کر دیا اور پھر کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس کی تجدید کرتا۔

کشمیر کے وہ باغات جو آج بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں ان میں ایک نشاط باغ ہے۔ اہل ذوق اور شعراء اس باغ سے نشاط وسرور کی دولت لے کر جاتے ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر ملکہ نور جہاں کے ساتھ یہاں اکثر آتا اور باغ سے لطف اٹھاتا یہ باغ امیر کدل سے سات میل دور چشمہ شاہی کے قریب واقع ہے اور چار طبقوں پر مشتمل ہے۔ صدر دروازے سے دا طبقوں پر مشتمل ہے۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی سنگ مرمر کے زینے آتے ہیں۔ اس کے بعد باغ کا پہلا طبقہ شروع ہوتا ہے۔ درمیان میں گذرگاہ ہے اور ہر دو جانب سنگ مرمر کے فوارے، درمیان میں ایک بڑا تالاب ہے۔ تیسرا طبقہ پہاڑ کے دامن تک چلا جاتا ہے۔ اس باغ میں صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی آ جا سکتے تھے، پہلا طبقہ عوام کے لیے اور دوسرا امراء وزراء کے لیے مخصوص تھا۔ نشاط باغ عہد جہانگیری میں بنایا گیا تھا۔ باغ تیار ہوا تو جہانگیر نے اس میں شعروسخن کی محفلیں آراستہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ تقریبات ہفتوں تک جاری رہتی تھیں۔ علامہ اقبال جب ۱۹۲۱ء میں کشمیر تشریف لے گئے تو آپ نے ساقی نامہ کے عنوان سے خوبصورت نظم اسی باغ میں کہی تھی۔

نشاط باغ کے بعد کشمیر کا اہم باغ شالامار باغ ہے۔ نشاط باغ سے دو میل کی مسافت پر شالامار باغ نظر آتا ہے، اس کی طرز تعمیر شالار مار باغ لاہور کی سی ہے۔ ۱۴۲۰ء میں جہانگیر نے اپنے قیام کشمیر کے دوران شالامار باغ کے ایک حصے کی تعمیر کروائی، یہ حصہ فرحت بخش کہلایا بقیہ حصے شاہجہان کی نگرانی میں تعمیر ہوئے۔

شالامار کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے دیوان کرپارام ''گلزار کشمیر'' میں لکھتا ہے جس کا ترجمہ یوں ہے ''یہاں کام دیو کا مکان تھا جسے شاستری والے مار کہتے ہیں اور شالا مکان کا نام ہے مل کر شالامار ہوا یعنی کام دیو کا مکان۔ دوسری تحقیق یہ ہے کہ کشمیری زبان میں ماردریا کو کہتے ہیں چونکہ اس جگہ پشمینہ دھویا جاتا تھا اس سے شالامار مشہور ہوا۔ کشمیر کے شالامار باغ کا حسن چناروں کے درختوں سے ہے۔ ایک مورخ کے بقول لگتا ہے کہ شعلہ بداماں چناروں نے باغ کو اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ اس کے چاروں طرف فوارے لگے ہوئے ہیں جن کی تعداد ایک سو پچاس ہے۔ ستون سنگ موسی سے بنائے گئے ہیں۔ موسم خزاں میں باغ کا نظارہ اور بھی دیدنی ہوتا ہے۔ چنار آگ کے شعلے برساتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سیاح برنیئر عالمگیر کے ساتھ سرینگر آیا تو شالامار باغ کو دیکھ کر اس کی تعریف میں یوں گویا ہوا:

یہ باغ نہایت خوبصورت ہے۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ ڈل سے ایک بڑی نہر میں سے ہے جس کے دونوں کناروں پر گھاس اگی ہے اور چنار کے درخت برابر دورویہ لگائے گئے ہیں۔ کشمیر کے عظیم شاعر غلام احمد مجہور نے باغ نشاط کے پھولوں کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''باغ نشاط کے گلو ناز کران کران ولو''

آزاد کشمیر ایک تعارف

ریاست جموں وکشمیر کا وہ حصہ جو ۱۹۴۷ء میں آزاد کرا لیا گیا تھا آزاد کشمیر کہلاتا ہے۔ آزاد کشمیر کے آٹھ ضلعے ہیں بھمبر، میر پور، کوٹلی، پونچھ، باغ، سدھنوتی، مظفرآباد اور نیلم۔ ان اضلاع کا تعارف سعید اسعد نے جو پیش کیا ہے اس کا خلاصہ اس طرح ہے۔ بھمبر گجرات سے ۲۸ میل دور ہے یہاں سے براستہ پیر پنجال ایک قدیم سڑک سرینگر کو جاتی ہے۔ یہ سڑک اکبر کے انجینئر محمد قاسم نے ۱۵۸۶ء میں تعمیر کروائی تھی۔ اسے مغل شاہراہ کہا جاتا ہے ماضی میں بھمبر ایک آزاد ریاست تھی جس کا نام چبھال تھا۔ یہاں کا راجہ سلطان خان بڑا دلیر تھا، گلاب سنگھ نے اس کی آنکھیں نکلوادی تھیں۔ بھوم چند کے نام پر جو بستی بھوم پور کے نام سے آباد ہوئی اسے بعد میں بھمبر کہا گیا۔ بھمبر کے عوام زراعت پیشہ ہیں۔ یہاں جاٹ راجپوت، گوجر، مغل اور جرال آباد ہیں۔ یہ علاقہ برگیڈیئر حبیب الرحمن کی قیادت میں ۱۹۴۷ء میں آزاد کرایا گیا۔ بھمبر میں مغل عہد کے تاریخی آثار موجود ہیں۔

میر پور نے ۱۹۶۰ء کے بعد ترقی کی، منگلا ڈیم تعمیر ہوا تو اکثر لوگ برطانیہ چلے گئے اور انہوں نے خوبصورت مکانات تعمیر کر کے میر پور میراں کو ایک جدید شہر بنا دیا۔ اس کے نزدیک مشہور صوفی شاعر حضرت میاں محمد بخش کا مزار ہے۔ میر پور میراں شاہ نے آباد کیا تھا جو گکھڑ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔

کوٹلی ضلعی صدر مقام ہے جو دریائے پونچھ کے کنارے آباد ہے۔ اسلام آباد یہاں سے ۱۴۱ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ شہر کی آبادی ۴۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ خوبصورت مساجد کا شہر ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔

شہر راولاکوٹ راول قوم نے آباد کیا ہوگا۔ راولاکوٹ اور اس اطراف سیاحت کے لیے مشہور ہیں، یہاں کی جھیل بن جوسہ مشہور ہے۔ راولاکوٹ وسیع جنگلوں، باغوں اور پہاڑوں کا

علاقہ ہے۔ اس علاقے کو مجاہد آزادی سردار محمد ابراہیم خاں کی نسبت سے شہرت ملی ہے۔ اسلام آباد ۱۳۱ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ باغ شہر تاریخی قصبہ ہے یہ نالہ ماہل اور نالہ ملوانی کے سنگم پر واقع ہے۔ افسوس کہ ۸ اکتوبر کے قیامت خیز زلزلے نے باغ کو ویران نہیں بلکہ خاک کے ساتھ برابر کر دیا لیکن یہ قدیم تاریخی شہر ایک دفعہ پھر اپنی شان و شوکت حاصل کر لے گا۔ (انشاء اللہ)

محقق کشمیر محمد سعید اسعد نے جو تحقیق پیش کی ہے اس کی رو سے مظفر آباد کو ۱۶۶۲ء میں مظفر خاں نے آباد کیا تھا، مظفر آباد دریائے نیلم اور دریائے جہلم کے سنگم پر واقع خوبصورت شہر ہے۔ اس شہر کو کوہالہ اور برار کوٹ کا راستہ پاکستان سے اور چکوٹھی کیرن کا راستہ کشمیر سے ملاتا ہے، اسی لیے میں اسے باب الکشمیر کہتا ہوں۔ مغل بادشاہ، علماء اور سیاح اسی راستے سے کشمیر جاتے رہے۔ مظفر آباد میں ایک تاریخی قلعہ گوجرہ میں ہے اور ایک قلعہ دریائے نیلم کے کنارے واقع ہے۔ اس میں ایک میوزیم بھی موجود ہے۔ ۸ اکتوبر کے زلزلے میں قلعے کا سامنے والا حصہ گر گیا ہے، سہیلی سرکار اور شاہ عنایت کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔ خدا کا ارادہ ایسا ہوا کہ اب مظفر آباد خاک کا ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔ امید ہے کہ اہل نظر اس شہر کو از سر نو تعمیر کر لیں گے۔ وادی نیلم کو حال ہی میں ضلع کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کا نام ضلع نیلم رکھا گیا ہے جس کا ضلعی صدر مقام اٹھمقام ہے۔ وادی نیلم دومیل سے شروع ہو کر تاؤبٹ تک جاتی ہے اس کا طول ۱۵۰ میل کے قریب ہے۔ جس طرح مظفر آباد میں تفریحی مقامات چکار، سدھن گلی پیر چناسی ہیں اسی طرح وادی نیلم کے اس ضلع کے تفریحی مقامات کیل اٹھمقام، کیرن، ددنیال، شاردا اور گریس ہیں۔ ضلع نیلم دریائے نیلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ یہ ضلع جنگلات، معدنیات اور صحت افزا مقامات کے لیے مشہور ہے۔ معدنیات میں گریفائٹ، سنگ مرمر، چونے کا پتھر، جپسم، یاقوت، ابرق اور گندھک کے ذخیرے ملتے ہیں۔

یہ ضلع اس لیے بھی مشہور ہے کہ یہاں قدیم عہد میں شاردا کے مقام پر ہندوؤں کا مندر اور یونیورسٹی تھی جس کے آثار آج بھی ملتے ہیں اور اندازہ ہے کہ شاردا رسم الخط بھی یہیں ایجاد ہوا۔

ضلع سدھنوتی کا صدر مقام پلندری ہے اور اس کی دوسری تحصیل تراڑکھل ہے۔ اس ضلع میں سدوزئی قبیلے کی اکثریت ہے اس لیے یہ علاقہ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ پلندری اور تراڑکھل سرسبز و شاداب اور تفریحی مقامات ہیں۔ آزاد کشمیر کے چاروں اضلاع کا ایک مختصر سا تعارف،

تفصیلی معلومات اس موضوع پر موجودہ کتابوں میں مل سکتی ہیں مطالعہ کیجیے ان کا اگر فرصت میسر ہو۔

مظفرآباد

آزاد کشمیر میں مظفرآباد، باغ اور میر پور تین قدیم اور مرکزی شہر ہیں۔ آج ہم مظفرآباد کی تاریخ وثقافت پر ایک نظر ڈالیں گے، یہ شہر جو آزاد حکومت کے قیام کے بعد دارالحکومت قرار پایا دریائے نیلم اور جہلم کے سنگم پر اور پیر چناسی کے دامن میں واقع ہے۔ ایک مقامی سردار مظفرآباد خان کے ذریعے آباد ہوا۔ میں اپنی تحقیق کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ لاکھوں سال پہلے مظفرآباد، بالاکوٹ اور پکھلی کا ایک علاقہ ایک جھیل میں ڈوبا ہوا تھا۔ نیاز پورہ سے لے کر بالاکوٹ تک سلسلہ کوہ میں سفید دریائی ریت کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے۔ جھیل خشک ہوئی تو یہاں زلزلے آئے چنانچہ رنجاٹہ اور ماکڑی کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ علاقے پہاڑوں سے لڑھک کر نیچے آ گئے ہیں۔ مظفرآباد کا پرانا نام چکڑی بہک ہے جہاں تالاب اور ان کے اردگرد چکنی مٹی تھی۔ یہ شہر سترہویں صدی کے نصف میں آباد ہوا کیونکہ ۱۶۱۹ء میں جہانگیر بادشاہ نے کشمیر جاتے ہوئے یہاں قیام کیا تھا۔ وہ اس شہر کا ذکر نہیں کرتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مظفرآباد اس کے بعد آباد ہوا۔ مظفرآباد باب کشمیر ہے اور چار شاہراہوں پر واقع ہے۔ کوہالہ اور برارکوٹ اسے پاکستان سے ملاتا ہے چکوٹھی اور نوسیری کشمیر سے متصل کرتی ہے۔ قدیم زمانے میں دریائے نیلم کو عبور کرنے کے لیے تین پل بنائے گئے تھے۔ جہانگیر نے پرانے سیکرٹریٹ کے سامنے ایک چبوترے انیتواں پر نوروز کا جشن منایا تھا۔

آزادی سے پہلے مظفرآباد ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، پھر ضلعی ہیڈکوارٹر بنا، گزشتہ پچاس برسوں کے دوران مظفرآباد نے شمال کی طرف چہیلہ بانڈی جنوب میں چھتر مغرب میں گوجرہ اور مشرق میں رنجاٹہ کو اپنی آغوش میں لیا۔ وادیوں میں پھیل جانے کے باعث میں مظفرآباد کو وادی مظفرآباد کا نام دیتا ہوں۔ شروع میں یہاں وادی کشمیر اور دیگر مقامات سے خاندان آ کر آباد ہوئے جن میں کشمیری، ترک، گوجر، مغل اور قریشی وغیرہ مشہور ہیں۔ یہ شہر علاقے کی ضروریات زندگی پوری کرتا رہا اور ایک اہم تجارتی مرکز رہا، صنعت میں مظفرآباد نے پارچہ بافی، نجاری، گل کاری، ظروف سازی، آہن گری، جفت سازی اور کانگڑی سازی میں نام پیدا کیا۔ سندھ کا کپڑا جسے سندس کہتے ہیں یہاں تیار ہوتا تھا اور

اسے سوسی کہتے تھے۔ یہاں کشمیر کے پکوان تیار ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ ان میں گشتابہ، آب گوشت اور کوفتہ مشہور ہے۔ تاریخی عمارات میں سلطانی مسجد، قلعہ گوجرہ اور قلعہ مظفرآباد اس کی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ قائداعظم ۱۹۴۴ء میں سرینگر سے واپس آتے ہوئے یہاں ایک رات کے لیے رکے تھے۔ یہاں سہیلی سرکار، شاہ عنایت، سید علاالدین گیلانی، قاضی قطب الدین اور میر واعظ مولانا یوسف شاہ کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔

آزادی سے قبل یہاں ایک مردانہ ہائی سکول تھا، ۱۹۵۲ء میں اورنٹیئل کالج قائم ہوا۔ آج درجنوں سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی ادارے قائم ہیں اور آزاد کشمیر یونیورسٹی کا مین کیمپس بھی اسی شہر میں ہے۔ ۱۹۶۰ء سے یہاں ریڈیو کام کر رہا ہے۔

مظفرآباد نے جن مشاہیر کو جنم دیا ان میں پیر حسام الدین، مولانا عبدالرحمان، قاضی غلام یٰسین، حاجی ولی جو چوہدری، ولی جو گنائی، پروفیسر مقبول احمد قریشی، ماسٹر عبدالعزیز، محمد خاں نشتر اور خواجہ عبدالقادر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مظفرآباد نے اپنی ترقی کا سفر ۱۹۴۷ء میں شروع کیا۔ ۲۰۰۵ء تک کے عرصہ میں اس خوبصورت شہر نے ثقافت، تعلیم، ادب، سیاست، تجارت اور معاشرت میں قابل رشک ترقی حاصل کر لی تھی۔ ابھی ترقی کی کئی منزلیں طے کرنا تھیں کہ ۸ اکتوبر کی صبح کو آٹھ بج کر پچپن منٹ پر زمین نے انگڑائی لی پھر چند سیکنڈ میں شہر تباہی کی چادر اوڑھ کر سو گیا، یہ ایک المناک حادثہ تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تو یہ شہر نئی شان وشوکت، نئی سج دھج اور نئی آن بان کے ساتھ ملبے سے ظہور پذیر ہو کر اپنے باشندوں کے زخموں سے پھول کھلا دے گا۔ جو زخم دیتا ہے وہی ان پر مرہم بھی رکھتا ہے کہ وہ نہایت رحیم ورحمان ہے اور یہ ہمارا ایمان ہے۔

شہر پونچھ

ریاست جموں وکشمیر میں سرینگر اور جموں کے بعد پونچھ اہم سیاسی، تہذیبی اور تمدنی اہمیت کا حامل شہر رہا ہے۔ پونچھ تتہ کوئی اور توسہ میدان کے دامن میں دریائے پونچھ اور نالہ بیتاڑ کے درمیان واقع ہے۔

پونچھ کا نام ''راج ترنگنی'' میں پرنوتسہ آیا ہے، فارسی کے مورخین نے اس کا لفظ پونچ، پنوچ، پرونچ اور پنوچہ ضبط کیا۔ چین کے بادشاہ شوئی چنگ نے نشو کے عہد میں یعنی ۹۴۲۔۸۸۲ کے درمیان مرتب ہونے والی تاریخ میں کشمیر کی پانچ ریاستوں میں پن نوتشہ پونچھ کو بھی شمار کیا گیا

ہے۔چینی سیاح ہیون سانگ نے پونچھ کا تلفظ پن نوٹو دیا ہے۔

خیال ہے کہ پونچھ شہر کو گونند خاندان کے راجہ بک (۶۳۷-۵۷۴ ق م) نے تعمیر کروایا تھا۔اس طرح اس شہر کی عمر ڈھائی ہزار سال بنتی ہے۔ایک تحقیق یہ ہے کہ اسے کارکوٹ خاندان کے راجہ مکہت اپیڈ نے ۶۹۵ میں تعمیر کروایا تھا۔

مغل عہد میں کشمیر جانے کا راستہ بھمبر،نوشہرہ، دھرم سالہ، چنگس راجور تھنہ اور پوشانہ تھا۔ ملا طغرا مشہدی نے اپنے رسالہ "تعداد النوادر" میں ہفت منازل کا ذکر کیا ہے۔پونچھ شہر ریاست کشمیر کا حصہ رہا ہے۔چینی سیاح ہیون سانگ نے راجہ درلبہ وردھن کے عہد یعنی ۶۳۱ء میں کشمیر اور پونچھ کی سیاحت کی۔وہ لکھتا ہے ٹیکسلا، ہزارہ، راجوری اور پونچھ کشمیر میں شامل ہیں۔ہندو دور میں راجوری، بھمبر، کشتواڑ، جموں اور ہزارہ پونچھ حکومت کا حصہ رہے۔ ۱۰۱۵ء میں محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو ترلوچن پال کھٹانہ نے اس کا مقابلہ کیا جو صوبہ سرحد کا حکمران تھا اور اس کا پایہ تخت صوابی کا مقام لاہور تھا۔

پونچھ کا فاصلہ میرپور سے اسی میل اور سرینگر سے چھیاسٹھ میل ہے۔پونچھ شہر ہر دور میں تحریک آزادی کا مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے۔پونچھ کھیل ورزش کے اعتبار سے ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔یہ شہر علاقہ کی ایک منڈی رہا ہے جہاں سے اطراف کے عوام ضروریات زندگی کی اشیاء خریدتے ہیں۔ہاتھی یہاں سرکاری طور پر فراہم کیے جاتے تھے جو شادی بیاہ کے موقعوں پر یا دریائے پونچھ میں طغیانی کے دنوں میں لوگوں کو آر پار لے جانے میں اہم رول ادا کرتے تھے، پونچھ مسجدوں اور باغوں کا شہر مشہور تھا، ہر باغ کسی خاص میوہ کے لیے مخصوص تھا مثلاً یہ باغ دیکھیے،خوبانی باغ، ہاڑی باغ اور بلم باغ وغیرہ۔

پونچھ کے چند بازاروں کے نام اس طرح ہیں بازار ہاتھی تھان، بازار نانبائیاں، چوک بازار، بازار قلعہ۔وی جے ہائی اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول یہاں کے مشہور تعلیمی ادارے تھے۔پونچھ کی خصوصیت یہ ہے کہ شہر کے لوگ گرمیوں میں علی آباد، شاہ پور، مندہار، کیرنی، ھلاں، حاجی بل ہانس منڈی، سورن، راجپور، اسلام آباد، گل ناگ، ساوجیاں چھانجل اور فتح پور جیسی سرسبز و شاداب ڈھوکوں میں جایا کرتے تھے اور غالباً آج بھی جاتے ہوں گے۔شہر کا منڈی ہال غالباً آج بھی جاتے ہوں گے۔شہر کا منڈی ہال علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا، یہاں کے چند اہل قلم کے نام یہ

ہیں۔ کرشن چندر، ٹھاکر چند پونچھی، تحسین جعفری، جیلانی کامران اور عبدالغنی۔ اسلامیہ ہائی اسکول کی طرف سے رسالہ "ادیب" اور ہائی سکول کی طرف سے "نوری چھم" نکلتا تھا۔ جن طلبہ نے پونچھ کے ہائی اسکول میں تعلیم پا کر شہرت حاصل کی ان میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں سردار محمد ابراہیم خاں، سردار محمد عبدالقیوم خاں، جسٹس محمد اقبال، سردار یار محمد خاں، سردار محمد حبیب خاں، میجر جنرل اے رحیم، جسٹس خواجہ محمد شریف، جسٹس سردار محمد شریف خاں، جسٹس راجہ خورشید احمد خاں، جسٹس محمد اسلم خان، سردار محمد رشید گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان، خواجہ عبدالغنی (لاسیکرٹری) خواجہ محمد شفیع ایڈووکیٹ، حافظ محمد یعقوب ہاشمی وغیرہ۔ ۱۹۴۷ء تک چالیس ہزار کی آبادی پر مشتمل پونچھ شہر اسلامی تہذیب وتمدن، فن وہنر صنعت وحرفت اور علم وادب کا گہوارہ رہا۔ اس کے بعد اس شہر نگاراں پر کیا بیتی یہ بات خونی لکیر سے پوچھیے جس نے سینہ چاکان چمن کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہے۔

وادی نیلم

آزادی سے قبل ضلع مظفر آباد تین تحصیلوں مظفر آباد، اوڑی اور کرناہ پر مشتمل تھا۔ وادی جہلم اور وادی نیلم ضلع مظفر آباد کی دو اہم وادیاں ہیں۔ کشن گنگا ندی کی وجہ سے اس وادی کا نام وادی کشن گنگا تھا مگر اب نیلم کا نام دیا گیا تو اسی نسبت سے اس وادی کا نام وادی نیلم ہو گیا۔ حال ہی میں اس وادی کو ضلع کا درجہ دیا گیا ہے اور ضلع کا نام نیلم ہے۔ وادی نیلم دومیل سے شروع ہو کر تاؤبٹ تک چلی جاتی ہے۔ نیلم دریا ہمالیہ کے اندرونی سلسلہ دراس سے برآمد ہوتا ہے پھر وادی تلیل سے بہتے ہوئے مغرب کا رخ کرتا ہے اور آگے رامن سندھ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے نالہ برزل سے مل کر گریس وادی میں بہنے لگتا ہے اور پھر مظفر آباد میں دومیل کے مقام پر دریائے جہلم میں جا ملتا ہے۔ دریائے نیلم کی ساری گزرگاہ پہاڑی ہے، اس لیے یہ تیز رفتاری سے بہتا ہے اور چونکہ آبادی سے اس کی سطح پست ہے لہٰذا یہ کھیتی باڑی کے کام نہیں آتا، دریائے نیلم برفوں سے نکلتا ہے۔ اس کا پانی اس قدر ٹھنڈا ہے کہ اس میں چند منٹ کے لیے ہاتھ رکھنا محال ہے۔ وادی نیلم کا پرانا نام دراوہ ہے جو ممکن ہے دراوڑ سے نکلا ہو، وادی نیلم کا بالائی حصہ یعنی جھلانہ سے آگے کا علاقہ سرسبز وشاداب ہے اور یہ علاقہ سیر وسیاحت کے لیے موزوں ترین سمجھا جاتا ہے۔ وادی نیلم مناظر فطرت، معدنیات، جنگلات اور آب وہوا کے لیے مشہور ہے۔ اس

وادی میں جو اہم مقامات سیاحت ہیں ان کا تعارف اس طرح ہے۔ مظفر آباد سے شمال کی طرف نو میل کے فاصلے پر پٹھیکہ کا مقام آتا ہے پٹھیکہ کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی ممکن ہے یہ اصل میں پٹا کہ ہو اور اس کا تعلق بدھ مت سے ہو کیونکہ پالی زبان میں پٹا کہ ٹوکرے کو کہتے ہیں اور مہاتما بدھ کی مذہبی کتاب کا نام تری پٹا کہ ہے یعنی تین ٹوکرے۔ پٹھیکہ نے آزادی کے بعد بہت ترقی کی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا چڑیا گھر اور ٹراؤٹ مچھلی کی پرورش کے لیے ایک پراجیکٹ کام کر رہا ہے۔ پٹھیکہ علاقہ کوٹلہ اور لچھراٹ کا اہم تجارتی مرکز ہے۔ اس کے مشرق میں ریں، گیدر اور ڈنہ کے گھنے جنگل ہیں جس کی وجہ سے اس کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہاں ریسٹ ہاؤس موجود ہے جہاں سیاح ٹھہرتے ہیں۔

کنڈل شاہی مظفر آباد سے ۷۴ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ دریائے نیلم اور نالہ جاگراں کے سنگم پر واقع ہے۔ ٹراؤٹ مچھلی بافراط ملتی ہے۔ یہاں کٹن کا علاقہ بے حد خوبصورت ہے اور مچھلی کی افزائش گاہ بھی ہے۔ سالخلہ کنڈل شاہی کے نزدیک نیلم ندی کے کنارے پر خوبصورت مقام ہے۔ یہ ایک اچھی تفریح گاہ ہے۔ اٹھئی اور مقام کو ملا کر اٹھمقام کہا جاتا ہے۔ سطح سمندر سے تیرا سو اکہتر میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ ضلع نیلم کا صدر مقام ہے یہاں تعلیمی ادارے، دفاتر اور گیسٹ ہاؤس موجود ہیں۔

اٹھمقام سے نو کلومیٹر آگے ہے یہ گھنے جنگلات کا علاقہ ہے اور مشہور سیر گاہ ہے۔ دواریاں کا فاصلہ اٹھ مقام سے تیرہ کلومیٹر ہے۔ سدا بہار جنگلات اور دریا کی روانی نے دواریاں کو حسین بنا دیا ہے۔ پچیس کلومیٹر کی دوری پر جھیل رتی گلی واقع ہے، یہاں ماہی پروری کا پراجیکٹ کام کر رہا ہے۔ دونیال سطح سمندر سے انیس سو ستاون میٹر بلند ہے اور سیاحت کے لیے اہم مقام ہے۔ تجیاں۔ یہ پر سکون اور صحت افزا مقام ہے۔ کئی نالے ندیاں دریائے نیلم میں آ کر ملتے ہیں۔ لوات وادی نیلم کا مشہور گاؤں ہے۔ معروف عالم دین اور سیاستدان مولانا غلام مصطفی اور مولانا سعید مسعودی اور انور شاہ کاشمیری کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ کیرن دریائے نیلم کے دونوں کناروں پر آباد ہے یہاں سے ایک راستہ کشمیر کو جاتا ہے، شاردا دونیال سے تیس کلومیٹر دور ہے۔ سطح سمندر سے بلندی انیس سو اکیاسی میٹر ہے۔ اس کے راستے میں دوئسٹ، خواجہ سیری اور کھری گام کے گاؤں پڑتے ہیں۔ یہاں قدیم مندر اور یونیورسٹی کے آثار موجود ہیں اور شاردا رسم

الخط یہیں ایجاد ہوا تھا، کیل شاردا سے انیس میل دور ہے۔ پہاڑوں کے سلسلوں اور جنگلات نے کیل کو حسین بنا دیا ہے۔ یہاں ہائیڈل پراجیکٹ کام کر رہا ہے۔ مقامی لوگ پولو کے شائقین ہیں، گریس حسین مقام سیاحت ہے۔ بانڈی پور سے ہوتے ہوئے راستہ سرینگر کو جاتا ہے۔ قدرتی چراگاہیں اور مناظر فطرت فراواں ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ اسکردو کو جاتا ہے۔ تلیل کی وادی تنگ مگر طویل ہے۔ درمیان سے نیلم بہتا ہے۔ خوبصورتی کی وجہ سے یہ علاقہ کشمیر کے مشابہ ہے۔ پھل پھول کثرت سے ملتے ہیں۔ شہد اور اخروٹ کے لیے مشہور ہے۔ مظفرآباد سے تاؤبٹ تک کی طویل وادی نیلم کے چند سیاحتی مقامات کا مختصر تعارف اور اب دریائے نیلم کے حوالے سے میں آپ کو اپنے ماہیے کے یہ بول سناتا ہوں:

نیلم ہے رواں ماہی
وقت جو بیت گیا لوٹے گا کہاں ماہی
نیلم ہے اداس اب کے دونوں کناروں پر
ہے خوف و ہراس اب کے نیلم نے تو بہنا ہے
عشق نہیں رکتا یہ آپ سے کہنا ہے

میرے زمانے کا مظفرآباد

گاؤں سے والدمحترم کے ساتھ ۱۹۴۴ء میں مظفرآباد دیکھنے کے لیے آیا تھا۔اس وقت میری عمر تقریباً بارہ سال تھی، آج اس واقعہ کو کوئی ساٹھ سال ہو گئے ہیں۔اس عرصہ میں میں نے مظفرآباد آباد ہوئے دیکھا اور پھر ۱۸ اکتوبر کو اس کی بربادی بھی میرے سامنے ہوئی۔اس شہر کی تاریخ کا ایک ایک واقعہ ذہن میں محفوظ ہے۔میری عمر کے لوگ کم رہ گئے ہیں جو ہیں وہ شاید اس تاریخ سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں اور اس کی جزویات کو فراموش ہی کر چکے ہوں، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرے زمانے کا مظفرآباد کیسا تھا اس کا ریکارڈ محفوظ کر دینا چاہیے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہو سکیں اور یہ جان سکیں کہ انہوں نے سفر کہاں سے شروع کیا تھا۔یہ شہر نیلم و جہلم کے سنگم پر اور پر پیر چناسی کے دامن میں واقع ہے۔

۱۹۴۴ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک مظفرآباد نے ترقی بہت کم کی اور اس کی ثقافت میں تبدیلی نہ ہونے کے برابر رہی۔چوالیس کے عشرے میں مظفرآباد چھوٹا سا قصبہ تھا۔آج کے بینک روڈ پر مندر کے نزدیک گاڑیوں کا اڈہ تھا۔راولپنڈی سے نندہ بس سروس اور الائیڈ چراغ دین کی بسیں یہاں پڑاؤ کر کے سرینگر روانہ ہو جاتی تھیں۔ڈھکی سے لے کر اپراوہ تک ایک ہی بازار تھا۔ ہندوؤں کی دکانیں پکی تھیں، سکھوں کی خاصی تعداد تھی۔اپراوہ کے پاس چھوٹی سی عیدگاہ تھی جو آج دکانوں میں آ گئی ہے۔شہر میں بڑی مسجدیں چار تھیں سلطانی، مسجد حمام، الی مسجد، بازار والی مسجد اور شاہ نازہ مسجد۔ان مساجد کے مینار نہ تھے بلکہ اذان دینے کے لیے چھت کے اوپر بانگی بنی ہوئی تھی۔حمام والی مسجد کا موذن احمد جو تھا وہ جب اذان دیتا تو آواز سارے شہر میں گونجتی تھی۔ مسجدوں کے اندر پنکھے کی جگہ کپڑے کی جھالر لگی ہوئی ہوتی جسے ایک آدمی بیٹھ کر ہلاتا رہتا اور اس سے نمازیوں کو ٹھنڈک ملتی تھی، شاہ نازہ مسجد کے نزدیک پن چکی یعنی جندر تھا اور یہاں پانی کا ایک نالہ بہتا تھا۔شہر میں ہوٹل نہیں تھے۔نانبائیوں کے تنوروں پر مسافر رات بسر کر لیا کرتے تھے۔

چند گھروں میں کھڈیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سوسی اور سرہندی کا کپڑا تیار ہوتا۔ جس سے عورتوں کے لباس تیار کیے جاتے تھے۔ بعض کھتریوں، سکھوں اور خواجگان کے علاوہ شہر کے مکان کچے تھے۔ دریا کے گول گول پتھروں اور مٹی سے دیواریں تیار ہوتیں اور چھت لکڑی اور گھاس کی ہوتی۔ بجلی ماکڑی سے لائی گئی تھی جو بہت ہی مدھم تھی۔ گھروں میں پرالی کی چٹائی استعمال ہوتی جسے پھنڈی کہتے ہیں۔ کشمیری قہوے کا رواج عام تھا، شہر کے کچھ تاجر دیہات سے مکھن بکرے کی کھالوں میں لاتے اور پھر اسے گرم کر کے گھی بنا لیتے، خواجہ بازار میں گھی کی خوشبو بکھری رہتی تھی۔ کانگڑی کا رواج عام تھا۔ دیہات کے لوگ پول پہنتے تھے۔ چنانچہ دکانوں پر کانگڑی اور پول لٹکتی نظر آتی۔ بازار میں کپڑا، نمک، گڑ عام جنس تھی یہ تینوں چیزیں دیہات کے لوگوں کی ضرورت تھی۔ شہر میں پینے کا پانی مشکوں اور کنستروں میں دریا کے کنارے ایک چشمے سے لایا جاتا۔ قدرتی برف سندھ بن سے جو آٹھ میل کے فاصلے پر ہے لائی جاتی اور پھر توت بازار میں بکتی تھی۔ گھروں میں لکڑیاں جلتی تھیں۔ ۱۹۷۰ء تک شہری جن میں افسر بھی شامل تھے صبح کے وقت اپر اڈہ پر چلے جاتے۔ دیہات سے لکڑیاں لانے والوں سے ایک گڈا روپے سوا روپے میں خرید کر لاتے۔ شہر میں طلبہ کے لیے ایک ہی ہائی اسکول تھا، ۱۹۵۱ء میں اورینٹیل کالج قائم ہوا۔ مظفر آباد میں کار اور جیپ ۱۹۵۵ء کے بعد آئی۔ اعلیٰ مناصب پر فائز افیسر ٹانگہ اڈہ سے ٹانگے پر بیٹھ کر سول سیکرٹریٹ جاتے، چھوٹے ملازمین پیدل جایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۲ء کے بعد یہاں کھیلوں کا چلن ہوا اور ادبی تقریبات ہونے لگیں۔ مظفر آباد ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو فتح کیا گیا اور ۲۴ اکتوبر کو آزاد حکومت قائم ہوئی۔ ڈوگرہ عہد میں اس خوبصورت شہر کو عمداً پس ماندہ رکھا گیا لیکن آزادی کے بعد تہذیب، ثقافت، تجارت، تعلیم اور ادب کے حوالے سے مظفر آباد نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے بعد میرے مظفر آباد کے سفر ارتقاء کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ تھی اس شہر نگاراں کی مختصر سی سرگزشت آج سوچتا ہوں خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

مظفر آباد ۱۸ اکتوبر کے بعد (۱)

۱۸ اکتوبر سے پہلے کے مظفر آباد کی خوبصورت اور رنگین تصویر میں نے اپنی ایک سابقہ گفتگو میں دکھادی ہے۔ آج زلزلے کا تیسرا دن ہے آج میں یہ چاہتا ہوں کہ ۱۸ اکتوبر کے بعد کی تصویر بھی دکھادوں مگر یہ نہایت بھدی، مدھم اور خاک آلودہ تصویر ہے۔ میں آپ کو خرابوں کی سیر کرواتا۔ ہوں آپ میرے ساتھ ساتھ آئیں۔ ہم کوہالہ کے راستے میں دومیل پل پر پہنچتے ہیں یہ پل قائداعظم پل کہلاتا ہے۔ یہاں سے ایک راستہ چکوٹھی سے ہوکر سرینگر جاتا ہے۔ بائیں طرف مڑیں تو دریا کے کنارے سنگم ہوٹل آپ کو نظر آئے گا جس کا ایک حصہ زلزلے کی نذر ہوگیا۔ اس سے آگے سائیں سہیلی کا مزار ہے، جو بالکل محفوظ رہا مگر مزار کی مسجد اور پریس کلب اور اس کے برابر گیسٹ ہاؤس ملبے کا ڈھیر بن گیا ہے۔ گیسٹ ہاؤس کے ساتھ ڈوگرہ عہد کا تعمیر شدہ سول سیکرٹریٹ تھا جس میں احتساب سروس کمیشن الیکشن کمیشن وغیرہ جیسے اداروں کے دفاتر تھے جو کہ سب زمین بوس ہو گئے۔ بس سرو کے چند درخت نوحہ کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں ساتھ ہی تعمیرات عامہ کے دفاتر تھے جن کی چھتیں اور دیواریں زمیں ریز ہیں۔ ذرا آگے دائیں جانب ڈاک خانہ کی جدید عمارت تھی جو بظاہر سالم نظر آتی ہے لیکن بڑے بڑے شگافوں نے اسے بے حال کر رکھا ہے۔ اب ہم بالائی جلال آباد چلتے ہیں، یہ دیکھیے ایوان صدر ہے جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ یہاں کوئی عمارت سالم نہیں ہے۔ خورشید نیشنل لائبریری کی عمارت بیٹھ چکی ہے اور اس میں چالیس ہزار کتابیں دب گئی ہیں۔ وزیراعظم ہاؤس بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اب ہم خورشید چوک میں آگئے ہیں یہاں دکانیں گری ہوئی ہیں پل تک سارا بازار ملبے سے بھرا پڑا ہے۔ جامع مسجد کی چھت ٹیڑھی ہوگئی ہے اور اس کا ایک حصہ ٹوٹ کر سڑک پر پڑا ہوا ہے۔ نیشنل بینک کی چھت زمین کے برابر ہوگئی ہے، کچھ لوگ ملبے کو کھود رہے ہیں مگر کون جانے یہ چور ہیں یا پولیس کے اہلکار۔ اس قیامت خیز ہنگامے میں کس کو خبر کہ کیا ہو رہا ہے۔ سامنے جنگلات کے دفاتر تھے یہ عمارات انیسویں صدی کے شروع میں تعمیر ہوئی تھیں۔ آج ان کا کوئی نشان ہے تو ملبہ او ربس اس سے ذرا آگے مظفر آباد کا جیل تھا جو ڈوگرہ عہد میں تعمیر ہوا۔ جیل کی عمارت گری تو مجرم بھاگ گئے اور کچھ کو قید حیات سے ہی رہائی مل گئی۔

نیلم پل کے سامنے سے جو راستہ گوجرہ کو جاتا تھا وہ چٹانیں گرنے سے بند ہو گیا ہے اور اب مظفرآباد اور گوجرہ کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ گوجرہ میں آرمی سکول، فیڈرل سکول اور پیر امڈ سکول کی ساری عمارتیں زلزلے کی زد میں آ کر نیست و نابود ہو گئیں۔ اب ہم نیلم پل سے دائیں طرف جانے والی سڑک پر چلیں گے۔ یہ ساری سڑک ملبے اور پتھروں نے بند کر دی ہے لیکن ہم پیدل جا سکیں گے۔ یہ رضوان سکول ہے جس میں سینکڑوں بچے شہید ہو گئے۔ ننھے منھے بچوں کے چھوٹے چھوٹے رنگین بستے نکال کر ملبے پر قطار میں رکھے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر آپ دہاڑیں مار مار کر نہ روئیں تو میرا ذمہ۔ یہاں سے ذرا آگے آرا مشین تھی اس کی چھت گری ہوئی نظر آتی ہے۔ مشین کے نشیب میں درجنوں مکان تھے جو صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ہیں اور لوگ اپنے پیاروں کی لاشیں نکال رہے ہیں۔ اس چوک سے اوپر جا کر دائیں طرف ریڈیو اسٹیشن کی عمارات تھیں جو ۱۹۶۰ء میں تعمیر ہوئی تھیں۔ نشریات کی مشینری اور عمارات ملبہ اوڑھ کر سو گئیں اور ریڈیو کی آواز حادثہ نے دبا دی۔ ٹی۔ وی اسٹیشن جو ایک سال قبل قائم ہوا تھا اس کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ ریڈیو کالونی سب تباہ ہو گئی۔ ریڈیو کے پروڈیوسر اظہر علی مہر کے تین معصوم بچے اس ملبے میں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ کالونی کی دوسری طرف مظفرآباد کا مشہور سول اینڈ ملٹری ہسپتال تھا جو وسیع میدان میں تعمیر ہوا تھا، زلزلہ آیا تو اس میں ہزاروں مریض اور سینکڑوں ڈاکٹر، نرسیں اور عملہ موت کی آغوش میں سو گیا۔ ملبے کے اندر موجود چھیڑ اور چنار کے درخت اپنی دلیری کی داستان سنا رہے ہیں۔ اب ہم مدینہ بازار اور خواجہ بازار میں جانا چاہتے ہیں لیکن نہیں جا سکتے کیونکہ دونوں بازاروں کی دکانیں گر گئی ہیں اور انہوں نے گلیوں کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ سامان تجارت کے ساتھ اکثر تاجر بھی ملبے کے اندر سو گئے ہیں۔ ایسا منظر دیکھ کر کون سنگ دل ہو گا جو آہیں اور آنسو بہانا بھول جائے۔ اب چلیے ہم بائیں طرف مڑتے ہیں۔ گوشت مارکیٹ ختم ہو گئی ہے۔ یونیورسٹی کا اولڈ کیمپس جہاں پہلے گورنمنٹ کالج تھا ملبے کا ڈھیر بن گیا ہے بس سرو کے درخت استیادہ ہیں جہاں جیالوجی کا شعبہ تھا وہاں کے کھنڈرات پر ایک فرانسیسی ٹی وی کا کیمرہ نصب ہے اور مجھ سے اس کالج کے بارے میں انٹرویو لے رہا ہے۔ شاہ عنایت کی زیارت محفوظ ہے البتہ کٹھہ والی مسجد، سیٹھی باغ اور عیدگاہ کا سارا علاقہ تباہ ہو گیا۔ پیر سلیم گیلانی کی کوٹھی، لائبریری اور وہ خود اس حادثے کا شکار ہو گئے۔ اب نیچے آتے ہیں۔ پولٹری فارم کی دیواریں، کھڑکیاں اور اینٹیں اس طرح بکھر گئیں جیسے مرغی کے پر نوچ کر بکھیر دیئے گئے ہوں۔ یہ کہانی آگے چلتی ہے آئندہ گفتگو سنیئے گا۔

مظفر آباد ۱۸ اکتوبر کے بعد (۲)

مظفر آباد کی تباہی کی کہانی باقی ہے سو وہ اسی طرح ہے۔ مظفر آباد کا پختہ قلعہ جو دریائے نیل کے دائیں کنارے پر ڈھائی تین سو سال قبل تعمیر ہوا اس کا وہ حصہ جو نیلم روڈ کی طرف تھا ٹوٹ گیا ہے، اس کی سرخ سرخ اینٹیں اور گچ سڑک پر بکھرے پڑے ہیں۔ یہ قدیم طرز کا نمونہ تھا جو چونا انڈہ، روٹی کا مسالہ بنا کر بنایا گیا تھا۔ جو قلعہ دشمنوں سے دفاع کے لیے تعمیر ہوا وہ آج زلزلے کے ایک ہی حملے میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ دیکھیے دو بکرال عورتیں اس کے ملبے سے دیوار کی پرانی لکڑیاں نکال کر لے جا رہی ہیں اور وہ ان لکڑیوں سے ایک وقت کا کھانا پکائیں گی۔

قلعے کے سامنے مشہور نیلم ہوٹل تھا جس کا مالک صوبہ سرحد کے مرد آہن خان عبدالقیوم خاں کا بھتیجا اور میرا لائق شاگرد مرحوم عبدالوحید تھا۔ سہ منزلہ نیلم ہوٹل گرا تو اس میں درجنوں مہمان اور کارکن ابدی نیند سو گئے۔ خود عبدالوحید کے خاندان کے بارہ سے زیادہ افراد شہید ہو گئے۔ عبدالواحید کی بیگم شیریں وحید جو آزاد کشمیر کی معروف سیاستدان اور سماجی کارکن تھیں ہم سے جدا ہو گئیں۔ آزاد کشمیر یونیورسٹی کا نیا کیمپس بری طرح متاثر ہوا۔ نئی عمارات میں شگاف پڑ گئے۔ یونیورسٹی کی لائبریری بھی متاثر ہوئی۔ یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریشن بلاک کے دروازے کو دیکھیے۔ سنگ مرمر کی بنی ہوئی دہلیز اس طرح اوپر اٹھی ہوئی ہے جیسے کسی چیز نے اسے نیچے سے اوپر اٹھا دیا ہو۔ چھلہ کا روڈ اندوہناک منظر پیش کر رہا ہے۔ پٹیکہ جانے والا روڈ کام سر سے لے کر کھوڑی تک بند ہی نہیں ہوا؟ لگتا ہے یہاں کوئی روڈ کبھی تھا ہی نہیں۔ اب اس سڑک کے کھولنے میں کئی مہینے لگیں گے۔ اب واپس لوئر پلیٹ کی طرف آتے ہیں۔ لوئر پلیٹ کے نیلم روڈ پر طالبات کا سہ منزلہ ہاسٹل تھا جو ڈھیر ہوا تو سینکڑوں طالبات کو یہ ہاسٹل نگل گیا۔ لوئر پلیٹ کے اکثر گھر یا تو بالکل تباہ ہو گئے اور یا ان میں ایسے شگاف پڑے کہ اب قابل رہائش نہیں رہے۔ میں اب شکستہ مکان کو دیکھ کر دل شکستہ نہیں ہوا بلکہ خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اور میرے خاندان کو بچا لیا۔

مظفرآباد شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر گھوما کر میں نے آپ کو اہم عمارات اور اداروں کی تباہی وبربادی کا منظر دکھادیا ہے۔ ہر گلی کوچے میں آپ کو لے جانا ممکن نہ تھا کہ وہاں تک رسائی مشکل ہے۔ اردگرد کی ساری آبادیاں چھتر نزل، طارق آباد، ڈھیریاں، ماکڑی، چھیلہ باج گراں، گوجرہ، نلوچی وغیرہ کی تصویر بھی وہی ہے جو شہر کی تصویر ہے۔ شہر اور دیہات میں کہرام مچا ہوا ہے۔ حکومت غائب ہے لوگ پریشان ہیں۔ پاکستان سے امداد آ رہی ہے۔ ٹرکوں کے ٹرک سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ ٹرک سڑک کے کنارے کھڑا کرتے ہیں اور اوپر سے سامان پھینکنا شروع کر دیتے ہیں۔

اب میں آپ کو بالا پیر لے چلتا ہوں تا کہ وہاں سے شہر کے اردگرد کی پہاڑیوں کا منظر دکھا سکوں۔ بالا پیر کے سامنے دائیں طرف نیاز پورہ کا علاقہ ہے۔ یہاں سے جو سفید لکیر سی دکھائی دیتی ہے وہ نیلہ دندی، چھیلہ اور دب گلی سے ہوتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ یہ سفید لکیر بالا کوٹ تک چلی گئی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ان پہاڑوں پر کسی نے سبزے کی چادر بچھا دی تھی جو زلزلے نے اٹھائی تو اس چادر کے نیچے سے سفید ریت کے پہاڑ نکل آئے۔ ایک دوست نے مجھے بتایا ہے کہ زلزلے کے دوران امریکہ نے جو تصویر لی تھی اور بعد میں کسی میگزین میں شائع ہوئی۔ اس تصویر میں یہ سفید لکیر چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی جو آگ کے شعلے کی طرح تھی۔ یہ تصویر میں نے خود نہیں دیکھی مگر شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ کسی رپورٹ میں میں نے پڑھا تھا کہ یہ زلزلہ دس ہزار ایٹم بموں کی طاقت کا ضرور ہوگا۔ جبھی تو آلائی، بالا کوٹ مظفرآباد اور باغ کے اطراف میں بڑے بڑے پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے اور دھنی ہوئی روئی کا منظر پیش کرنے لگے۔ خوفناک آوازوں کے ساتھ پہاڑ ٹوٹے اور گرد وغبار سے سارا علاقہ چھپ گیا۔ اطراف مظفرآباد اور خاص طور سے مظفرآباد کے مشرق اور شمال میں جو بلند وبالا پہاڑ ننگے ہوئے تو وہ سفید ریت کا سمندر نظر آنے لگے۔ اس سے میرے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آج سے اربوں کھربوں سال پہلے مظفرآباد، گڑھی حبیب اللہ، بالا کوٹ اور پھلی کی وادیاں جھیل کے اندر تھیں۔ بلندیوں پر سفید ریت کا وجود اور ترائیوں میں گول گول پتھروں کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ وسیع علاقہ جھیل اور سمندر کے نیچے رہا ہوگا۔ جھیل خشک ہوئی تو ریت کناروں پر اور گول پتھر نشیبوں میں باقی رہ گئے۔ زلزلے نے چادر اٹھائی تو ریت کے سفید پہاڑ نمایاں ہو گئے۔ یہ حال کی کہانی تھی۔ مستقبل کی بشارت کہ زلزلہ زدہ علاقوں میں زندگی پھر مسکرائے گی اور رونقیں دوبارہ لوٹ آئیں گی۔ انشاءاللہ:

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

جناب کے۔ایچ خورشید (۱۹۲۴ء۔۱۹۸۸ء)

خورشید حسن خورشید جو کے۔ایچ خورشید کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۳ جنوری ۱۹۲۴ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی محمد حسن عالم دین تھے جو کئی برسوں تک گلگت میں ہیڈ ماسٹر رہے اور پھر انسپکٹر آف مسلم سکولز کے عہدے پر فائز رہے۔ خورشید صاحب نے میٹرک ۱۹۳۸ء میں پاس کیا۔ ایف۔اے میں داخلہ امر سنگھ ڈگری کالج سرینگر میں لیا، آپ اسی زمانے میں ایک مقرر اور مضمون نویس کے طور پر مشہور ہوئے۔ آپ نے ۱۹۴۰ء میں مسلم سٹوڈنٹس یونین کی بنیاد رکھی اور اس یونین کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ مسلم سٹوڈنٹس یونین نے ریاست جموں وکشمیر میں تحریک پاکستان کی حمایت کی، چنانچہ جب آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس یونین کا سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۴۲ء میں جالندھر میں ہوا تو قائداعظم نے خورشید صاحب کو حسن کارکردگی کا پرچم عطا کیا۔

انہی دنوں کے۔ایچ خورشید نے صحافت کے ذریعے تحریک آزادی کو عام کرنے کا عزم کیا اور اپنے بڑے بھائی محمد امین شمیم کے تعاون سے ایک سماجی اخبار نکالا۔ ۱۹۴۳ء میں اے۔آر ساغر کے اخبار ہفت روزہ ''جاوید'' سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۴ء میں قائداعظم سرینگر تشریف لے گئے تو مسلم سٹوڈنٹس یونین کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے خطبہ استقبالیہ خورشید مرحوم نے ہی پیش کیا۔ قائداعظم کی نظر جوہر شناس نے ان کو منتخب کر لیا اور آپ کو قائد نے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ کے۔ایچ خورشید قائداعظم کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور قائد کے ساتھ روزانہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کر کے ایک مثال قائم کی۔ قائداعظم نے ایک موقع پر فرمایا ''پاکستان میرے ٹائپ رائٹر اور میرے سیکرٹری نے بنایا ہے، کے۔ایچ خورشید عزیزوں سے ملنے کے لیے ۱۹۴۷ء میں سرینگر گئے تو ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ عرصہ سرینگر جیل میں اور پھر رام نگر جیل میں قید رکھا گیا۔ جب رہائی ملی تو ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے۔ پاکستان آ کر جناب کے۔ ایچ خورشید نے ایک صحافی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ گارڈئین کا اجراء کیا۔ بعدازاں آپ ایک صحافتی تنظیم کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس تنظیم کے اراکین میں حمید نظامی،

شورش کاشمیری، زیڈ اے سلہری اور عزیز بیگ قابل ذکر ہیں۔ تنظیم کے صدر فیض احمد فیض تھے۔ اسی دوران آپ نے حکومت امریکہ کی دعوت پر اس ملک کا دورہ کیا۔ واپس آئے تو محترمہ فاطمہ جناح کے مشورے پر برطانیہ چلے گئے اور بار ایٹ لاء کیا اور ۱۹۵۴ء میں واپس آ گئے اور کراچی میں وکالت کرنے لگے۔ کے۔ ایچ خورشید ۱۹۵۴ء میں حکومت آزاد کشمیر کے پبلسٹی ایڈوائزر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں کے۔ ایچ خورشید کو آزاد کشمیر کا صدر بنا دیا گیا۔ آپ نے آزاد کشمیر میں بنیادی جمہوری نظام رائج کیا اور کونسلرز کا انتخاب کروایا۔ ۱۹۶۲ء میں آپ نے جموں وکشمیر لبریشن لیگ قائم کی۔ آپ نے آزاد کشمیر میں زرعی اصلاحات کیں اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر دیا۔ آپ کو متعدد مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر ہمیشہ کامیاب رہے۔ ۱۹۷۳ء میں آپ نے برطانیہ کا دورہ کیا۔ ۱۹۸۶ء میں کے۔ ایچ خورشید انتخابات میں کامیاب ہوئے اور قائد حزب اختلاف کا رول کامیابی سے ادا کیا۔ آپ ہمیشہ جمہوریت کی بحالی اور آزادی کے لیے سرگرم عمل رہے، آپ نے ۱۰ مارچ ۱۹۸۸ء کو میرپور میں وکلاء کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''انسان آتے جاتے رہتے ہیں مگر ان کے اصول ہمیشہ زندہ رہتے ہیں جو لوگ اصولوں کی خطار زندہ رہتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کی خاطر جدوجہد کرنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اس کنونشن کے بعد جناب کے ایچ خورشید ۱۱ مارچ کو لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ گجرات تک ایک دوست کی گاڑی میں گئے۔ وہاں سے لاہور جانے والی ویگن میں بیٹھے۔ گوجرانوالہ بائی پاس سے گزرتے ہوئے تیز رفتار ویگن کو ڈرائیور نے سڑک کے کنارے کھڑی ٹرالی سے ٹکرا دیا اور خود بھاگ کھڑا ہوا۔ کے۔ ایچ خورشید فرنٹ سیٹ پر تشریف رکھتے تھے چنانچہ شدید زخمی ہوئے اور ہسپتال میں دم توڑ دیا۔ آپ کی نماز جنازہ ۱۲ مارچ کو لاہور میں اور ۱۳ کو مظفرآباد میں ادا کی گئی۔ آخری وصیت کے مطابق آپ کو مظفرآباد میں یونیورسٹی گراؤنڈ کے بالمقابل دفنا دیا گیا جہاں آپ کا خوبصورت مزار بنایا گیا جو کراچی میں مزار قائد کے نقشے پر بنایا گیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس عظیم کشمیری رہنما کے مزار کو ۱۸ اکتوبر کے قیامت خیز زلزلے نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا حالانکہ سارا شہر ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ کے۔ ایچ خورشید کو اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنی جمہوری روایات سے پیار تھا۔ اور پیار بھی عشق کی حد تک آپ مر کر امر ہو گئے۔ بقول شاعر:

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گزر گیا

سردار محمد ابراہیم خاں (۱۹۱۵ء۔ ۲۰۰۳ء)

ریاست جموں وکشمیر کے عظیم سیاستدان اور ماہر قانون جناب سردار محمد ابراہیم خاں ۲۲ اپریل 1915ء کوراولاکوٹ کے نزدیک ایک خوش منظر گاؤں میں پیدا ہوئے۔آپ سدھن قبیلہ کے چشم وچراغ تھے۔محمد عالم خاں کے ہونہار فرزند نے میٹرک پونچھ شہر کے ہائی اسکول سے پاس کیا۔۱۹۳۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے کیا۔آپ ۱۹۴۰ء میں بارایٹ لاء کرنے کی غرض سے ولایت گئے اور ۱۹۴۲ء میں واپس آئے تو حکومت نے ان کو میرپور میں پبلک پراسیکیوٹر مقرر کر دیا لیکن آپ جیسا آزادی پسند اور آزادہ رو آدمی ملازمت میں نہ رہ سکتا تھا چنانچہ آپ ملازمت ترک کر کے سیاست میں آ گئے۔آپ جنوری ۱۹۴۷ء میں کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لے کر کامیاب ہوئے۔سردار صاحب نے جماعتی سیاست میں ایک بنیادی رول ادا کیا۔ ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو ان کے گھر محلہ آبی گزر سرینگر میں مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ کشمیر کا مہاراجہ ریاست جموں وکشمیر کا الحاق پاکستان سے کر دے۔اس قرارداد کو قرارداد الحاق پاکستان کہا جاتا ہے جو بعد میں تحریک آزادی کے لیے سنگ میل ثابت ہوئی۔آپ ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کشمیر سے نکل کر ایبٹ آباد آ گئے اور پھر ۲۴ اکتوبر کو حکومت پاکستان کے مشورے پر سردار محمد ابراہیم خاں کی سربراہی میں آزاد حکومت قائم ہوئی اور آپ نئی آزاد حکومت کے پہلے صدر مقرر ہوئے ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کے کہنے پر آپ کو اقوام متحدہ میں بھیجا گیا اور آپ نے بھرپور نمائندگی فرمائی۔۱۹۵۷ء کو دوسری بار سردار محمد ابراہیم خاں کو آزاد حکومت کا صدر نامزد کیا گیا اور آپ ۱۹۵۹ء تک اس منصب پر فائز رہے۔۵ جون ۱۹۷۵ء سے ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء تک سردار صاحب تیسری مرتبہ آزاد کشمیر کے صدر رہے، چوتھی بار ۲۳ اگست ۱۹۹۶ء سے ۲۴ اگست ۲۰۰۱ء تک آپ صدر حکومت رہے۔سردار محمد ابراہیم خاں ۳۱ جولائی ۲۰۰۳ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے اور انہیں اپنے گاؤں میں سپرد خاک کیا گیا۔

سردار صاحب مرحوم نے آزاد کشمیر کی سیاست میں ایک اہم رول ادا کیا۔ سردار صاحب ریاست جموں وکشمیر کے اولین رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے ڈوگرہ حکومت کے خلاف پرچم بلند کیا اور آزادی کی تحریک چلائی۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین دلیر اور محب وطن لیڈر تھے۔ آپ نے دیار مغرب میں رہ کر وہاں کی روایات، ثقافت اور تہذیب کا مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا۔ آپ کا مطالعہ وسیع اور تجربہ عمیق تھا۔ وقت کے پابند تھے۔ سردار صاحب انگریزی اور اردو کے بہت اچھے مقرر تھے۔ ان کی تحریر بھی خوب تھی۔ پرانے بزرگوں کی سی شفقت اور وقار ان میں موجود تھا۔ وہ ہماری بزرگ نسل کے نمائندہ بزرگ تھے۔ ایک سچے اور کھرے انسان، ایک بڑے انسان اور بااخلاق انسان۔ ایک نیک اور ایماندار انسان تھے۔

سردار محمد ابراہیم خاں جہاں اچھے مقرر تھے وہاں وہ کامیاب ادیب اور قلمکار بھی تھے۔ ان کی سوانح ''متاع زندگی'' کا مطالعہ قاری پر ایک نئی دنیا کے درواکر دیتا ہے۔ اس سوانح میں سردار صاحب کی نجی اور سیاسی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور معاصر تاریخ وانقلابات عالم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ انگریزی میں سردار محمد ابراہیم خاں کی تصنیف ''کشمیر ساگا'' ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سردار محمد ابراہیم خاں بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ ایک بڑے سیاستدان، ایک سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے بھی ان کا کام اور نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

چوہدری غلام عباس (۱۹۰۴ء۔۱۹۶۷ء)

جناب چوہدری غلام عباس ریاست جموں وکشمیر کے سب سے بڑے سیاسی رہنما تھے۔ آپ ۴ جنوری ۱۹۰۴ء کو جموں شہر میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد چوہدری نواب دین جالندھر کے رہنے والے تھے مگر جموں آ کر ملازمت اختیار کی اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد چوہدری نواب دین نے عرائض نویسی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چوہدری غلام عباس نے ابتدائی تعلیم جموں کے مشن ہائی اسکول میں حاصل کی۔ آپ ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ ۱۹۲۱ء میں میٹرک پاس کیا اور پھر پرنس آف ویلز کالج جموں میں داخلہ لیا۔ چوہدری غلام عباس نے 1925ء میں بی۔اے پاس کیا۔ گریجویشن کرنے کے بعد آپ نے جموں کے ہائی اسکول میں بطور معلم خدمت کرنا شروع کی مگر جلد ہی یہ ملازمت ترک کر دی۔ چنانچہ 1929ء میں آپ لاہور چلے گئے اور لاہور کے کالج میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۳۱ء میں ایل ایل بی ہو گئے۔

چوہدری غلام عباس زمانہ طالب علمی سے ہی سماجی اور اصلاحی کاموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ جموں میں ینگ مینز مسلم ایسوی ایشن ایک معروف اور فعال تنظیم تھی آپ اس کے پروگراموں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء میں آپ اس ایسوی ایشن کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جموں میں توہین مذہب کے واقعات پیش آئے تو چوہدری صاحب نے ینگ مینز ایسوی ایشن کے پلیٹ فارم سے اہم رول ادا کیا۔ ۱۳ جولائی میں سرینگر میں ۲۲ مسلمانوں کو شہید کیا گیا اور تحریک چلی تو ریاست کے جن بڑے بڑے اور بااثر سیاسی زعما کو گرفتار کیا گیا ان میں جناب چوہدری غلام عباس بھی شامل تھے۔ ۱۹۳۲ء میں آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی تو چوہدری غلام عباس اس کے پہلے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے۔ بعد میں آپ اس سیاسی جماعت کے صدر منتخب ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ڈائریکٹ ایکشن کی تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی تو چوہدری صاحب کو دیگر کارکنوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور

رہائی اس وقت نصیب ہوئی جب برصغیر کی تقسیم ہو چکی تھی اور پاکستان بن چکا تھا۔ چوہدری غلام عباس جب تین سالہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو رہا ہوئے تو شیخ عبداللہ کی حکومت نے آپ کو سیالکوٹ بھیج دیا۔ آپ کی خدمات اور قابلیت سے پاکستان بخوبی آگاہ تھا اس لیے آپ کو مہاجرین جموں وکشمیر کی آبادکاری کے امور کا نگران اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ چوہدری غلام عباس کو آزاد کشمیر کی حکومت کا سپریم ہیڈ بنایا گیا لیکن جب اس دور کی سیاست نے آپ کی پالیسیوں کو کامیاب نہ ہونے دیا تو آپ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس زمانے میں شاعر نے کہا تھا:

قافلہ تو تھک چکا تھا تھک گیا سالار بھی

چوہدری غلام عباس تحریک آزادی کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے ۱۹۵۸ء میں جنگ بندی لائن عبور کرنے کے لیے تحریک کا آغاز کیا۔ ہزاروں لوگوں کے جتھے چکوٹھی کے طرف مارچ کرنے کے لیے آ گئے، ایک گروہ کی قیادت آپ خود کر رہے تھے کہ کوہالہ کے مقام پر گرفتار کر لیے گئے اور یہ تحریک پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ تاہم آپ رہنمائی کرتے رہے اور رہنماؤں کی ایک نئی کھیپ تیار کر ڈالی۔

چوہدری غلام عباس ریاست جموں وکشمیر کے بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے اور مقبول ترین سیاسی رہنما تھے جن کی گوناگوں خدمات کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

زندگی کے آخری مہینوں میں چوہدری غلام عباس کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تو آپ کو علاج کے لیے لندن بھیجا گیا لیکن یہ علاج موثر نہ ہوا اور آپ ۱۸ دسمبر ۱۹۶۷ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ وصیت کے مطابق اس یگانہ روزگار قائد ملت کو راولپنڈی میں فیض آباد کے مقام پر دفنایا گیا جہاں ان کا مزار خوبصورت انداز میں بنایا گیا ہے۔

میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ

میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ نے کشمیر کی سیاست میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کی روحانی شخصیت مسلمانان کشمیر کے فکر وخیال پر ہمیشہ اثر انداز رہی ہے۔ آپ ۱۸۹۰ء میں کشمیر کے شہر سرینگر میں متولد ہوئے۔ آپ کے والد گرامی میر واعظ مولانا رسول شاہ بھی کشمیر کی ایک بڑی روحانی شخصیت تھے، میر واعظ خاندان نے کشمیری مسلمانوں کی مذہبی اور روحانی رہنمائی کی۔ مولانا محمد یوسف شاہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی، پھر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر کشمیر آئے اور غلامی کے خلاف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرس قائم ہوئی تو میر واعظ مرحوم نے اس جماعت کے جھنڈے تلے آزادی کشمیر کی جدوجہد کو تیز تر کر دیا۔ آپ نے "سہ روزہ اسلام" اور ایک رسالہ "رہنما" جاری کیا تھا۔ آپ حضرت میر واعظ شہرہ آفاق صوفی اور مبلغ اسلام حضرت شاہ ہمدان کی اولاد سے ہیں۔ شاہ ہمدان ساتویں صدی ہجری میں تقریباً سات سو علماء، صوفیاء اور ہنرمندوں کے ایک گروہ کے ساتھ کشمیر آئے تھے۔ یہ لوگ وادی کشمیر کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے اور صنعتوں اور دستکاریوں کو فروغ دینے لگے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

خطہ را آن شاہ دریا آستیں
داد علم و صنعت و تہذیب و دیں

شاہ ہمدان کا یہ خاندان غلامی اور جہالت اور توہمات کے خلاف ہر دور میں پرچم بلند کرتا رہا ہے اور آج بھی آزادی وحریت کا جھنڈا بلند کیے ہوئے ہے۔

مولانا محمد یوسف شاہ ایک مستند عالم دین اور ایک مقبول مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش گفتار واعظ اور مفسر قرآن بھی تھے، کشمیری زبان ان کی مادری زبان تھی لیکن عربی، فارسی اور اردو کے بھی ماہر تھے۔ قرآن حکیم کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ کشمیری زبان

میں میر واعظ صاحب نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی ہے۔اس طرح آپ پہلے کشمیری عالم دین ٹھہرتے ہیں جنہوں نے کشمیری میں قرآن کا ترجمہ پیش کر کے ایک تاریخی کارنامہ کیا ہے۔ حضرت میر واعظ کا نام ایک صوفی، ایک سیاستدان، ایک سماجی مصلح، ایک ادیب اور ایک مفسر قرآن کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا تو آپ مسلم لیگ کے رہنماؤں سے ملنے کے لیے پاکستان آ گئے لیکن آپ پھر کشمیر نہ جا سکے اور یہیں ٹھہر گئے۔ ۱۹۵۱ء میں میر واعظ حضرت مولانا محمد یوسف شاہ کو آزاد کشمیر کا صدر بنا دیا گیا اور اس عرصہ میں آپ نے آزاد کشمیر میں نظم ونسق بحال کیا اور تحریک آزادی کو بھی جاری رکھا۔آپ جون ۱۹۵۲ء تک صدر آزاد کشمیر کی حیثیت سے ملت کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ کو دوبارہ صدر آزاد کشمیر نامزد کیا گیا۔ مذہبی اور سیاسی حلقے آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔اب آپ کا آوازہ بیرون ملک بھی پہنچ چکا تھا۔ یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب میر واعظ صاحب کو مسئلہ کشمیر سے واقف کرانے اور حمایت حاصل کرنے کے لیے بیرون ملک بھیجا گیا۔ چنانچہ آپ نے مصر، الجزائر وغیرہ ممالک کا دورہ کر کے وہاں سیاستدانوں، صحافیوں، دانشوروں اور عوام کو مسئلہ کشمیر کی اہمیت سے آگاہ فرمایا۔

آخری عمر میں حضرت مولانا محمد یوسف شاہ نے پیرانہ سالی کے باعث عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن دینی اور روحانی رہنمائی بدستور فرماتے رہے۔اس زمانے میں آپ راولپنڈی میں رہائش پذیر رہے۔ تاہم ان کو سرزمین کشمیر سے اس قدر پیار تھا کہ آپ نے یہ وصیت کر رکھی تھی کہ انہیں آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد میں سپرد خاک کیا جائے۔اس یگانہ روزگار کشمیری رہنما کی وفات ۱۹۶۸ء میں راولپنڈی میں واقع ہوئی تو آپ کا جسد خاکی مظفر آباد لایا گیا اور وہاں یونیورسٹی گراؤنڈ کے سامنے ایک خوبصورت جگہ پر دفنایا گیا۔آپ کے مزار پر ایک نہایت خوبصورت گنبد بنایا گیا ہے۔آپ کا یوم وفات نہایت عقیدت سے منایا جاتا ہے اور مزار پر حاضری دینے کے لیے عقیدت مند آتے اور دعائیں مانگتے ہیں۔بس کے ذریعے کشمیر سے آنے والے لوگ بھی مزار پر آ کر دعا کرتے ہیں اور اس طرح اپنے محبوب مذہبی رہنما اور سیاسی قائد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔حضرت میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ان کے خوابوں کو تعبیر ضرور ملے گی۔

مولانا محمد انور شاہ کاشمیری

برصغیر کے عالم دین اور محدث حضرت مولانا محمد انور شاہ کاشمیری کا آبائی وطن کشمیر ہے اور آپ اسی نسبت سے کاشمیری کہلاتے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا تعلق وادی نیلم کے مردم خیز گاؤں لوات سے تھا۔ مشہور سیاستدان مولانا محمد سعید مسعودی بھی اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ مولانا محمد انور شاہ ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو لوات میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے چند ہفتے بعد آپ کو وادی لولاب کے گاؤں دودھواں میں لے جایا گیا جہاں آپ کے والد پیر محمد معظم شاہ رہتے تھے۔

مولانا کو ابتدائی تعلیم گھر پر ہی دی گئی۔ ۱۸۸۸ء میں جب آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی آپ ایبٹ آباد کے نزدیک کاکول چلے گئے۔ جہاں اس زمانے کے معروف فقیہ مولانا احمد جی نے مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ مولانا احمد جی کے والد مفتی قیام الدین قریشی کرناہ سے منتقل ہو کر کاکول جاتے تھے۔ انہوں نے کاکول میں مولانا فضل دین سے بھی فقہ کا درس لیا تھا۔

مولانا انور شاہ ۱۸۹۳ء میں دیوبند چلے گئے اور اس درس گاہ میں حدیث اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے ۱۸۹۷ء میں مولانا محمود الحسن کے ہاتھ سے سند فراغت حاصل کی۔ مولانا نے بعد میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے ہاتھ پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی ۱۸۹۸ء میں آپ نے مولانا امین الدین کے تعاون سے دہلی میں مدرسہ امینیہ کی بنیاد رکھی اور ۱۹۰۳ء تک یہاں درس دیتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو آپ لولاب آ گئے اور یہاں علامہ اقبال کے دوست خواجہ عبدالصمد ککرو کے ایماء پر بارہ مولہ مدرسہ میں فیض عام جاری کیا اور ۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ سفر حج کے دوران مولانا انور شاہ نے طرابلس، بصرة، مصر اور شام کے علماء سے ملاقاتیں کیں واپس آ کر آپ بارہ مولہ کے مدرسہ فیض عام میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ ۱۹۱۱ء میں دیوبند چلے گئے اور حدیث کا درس دینا شروع کیا اور ۱۹۱۵ء تک قائم مقام صدر المدرسین رہے اور ۱۹۲۰ء تک آپ صدر المدرسین کے عہدے پر فائز رہے

اور آٹھ سال تک اسی حیثیت سے دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا انور شاہ کاشمیری اختلاف کے بعد دیوبند سے ڈابھیل ضلع سورت گجرات چلے گئے اور وہاں پانچ سال تک حدیث پڑھاتے رہے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ مدرسہ ڈابھیل کا انتظام اپنے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی کے سپرد کر کے دیوبند آ گئے۔ دیوبند میں ہی آپ کا انتقال ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو ہوا۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیری اردو، عربی اور فارسی کے ماہر تھے اور دینی علوم میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔ آپ بہت بڑے عالم دین، خطیب، مناظر شاعر، فقیہہ، محدث اور مصنف تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد درجن کے قریب ہے۔ مولانا کی قابلیت اور عربی دانی کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ عربی کے کامیاب شاعر تھے۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم ان کا معرکتہ الارا عربی قصیدہ ہے جو حدوث عالم کے موضوع پر ہے۔ آپ نے صحیح بخاری کی شرح ''فیض الباری'' کے نام سے تحریر کی جو دینی مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ آپ نے اپنی فارسی تصنیف قادیانیت میں قادیانیت کا ابطال کیا ہے۔ ''فصل الخطاب''، ''عقیدۃ الاسلام''، ''اکفار الملحدین''، ''التصریح'' اور ''کشف الاسرار'' آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولانا محمد انور شاہ اس قوم کے ہیرو تھے جس قوم کو علامہ اقبال نے تر دماغ کا لقب دیا ہے۔ کشمیری قوم کی ذہانت مولانا محمد انور شاہ کو ورثہ میں ملی تھی۔ یہ روایت درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے کہ مولانا کتاب کو ایک بار پڑھ لیتے تو وہ ان کو ازبر ہو جاتی تھی۔ آپ علم کے سچے عاشق اور کتاب کے قدردان تھے۔ ان کی ساری زندگی مطالعہ کتاب اور درس و تدریس میں گزری۔ آپ کی ذہانت، قابلیت اور محنت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آپ وادی کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے اٹھے اور دیوبند جیسی بڑی درسگاہ کے صدر المدرسین ہوئے اور برصغیر کے علماء میں ایک بلند مقام پایا بلکہ سب کے مرجع ٹھہرے۔

مولانا کی فلسفہ دانی کا عالم یہ کہ علامہ اقبال جیسا بڑا فیلسوف ان سے استفادہ کرتا رہا۔ علامہ نے مولانا کشمیری سے زمان کی حقیقت سمجھنے میں بھرپور استفادہ کیا۔ علامہ کے خطوط بنام انور شاہ کاشمیری شائع ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا یعقوب صرفی، ملا کمال، بابا داؤد اکی اور محسن فانی کے بعد مولانا محمد انور شاہ کاشمیری خطہ کشمیر کے سب سے بڑے عالم دین اور فیلسوف ہو گزرے ہیں، کشمیر ان کی ذات پر صدیوں تک فخر کرتا رہے گا۔

خواجہ عبدالصمد مقبل

بارہ مولہ کشمیر کا ککرو خاندان علم وعرفان اور سخاوت ودریادلی کے حوالے سے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔خواجہ علی جو ککرو کا بیٹا عبدالصمد ککرو جو بعد میں مقبل کے نام سے متعارف ہوا ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوا خواجہ عبدالصمد ککرو شاعر وادیب تھا اور وہ بیرون کشمیر بھی مقبل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مقبل نے بارہ مولہ میں ایک اصلاحی تحریک کی بنیاد رکھی، اس تحریک نے ڈوگرہ غلامی کے خلاف رائے عامہ کو ہموارہ کیا۔

خواجہ عبدالصمد مقبل انجمن حمایت اسلام لاہور کے سرگرم رکن تھے اور اسی بناء پر ان کے تعلقات علامہ اقبال سے قائم ہوئے۔ مقبل سر عبدالقادر کے احباب میں سے تھے۔مقبل نے بارہ مولہ میں مولانا انور شاہ کاشمیری کے تعاون سے انجمن اسلامیہ قائم کی تھی۔مولانا جب بھی بارہ مولہ آتے مقبل ہی کے پاس قیام کیا کرتے۔مقبل نے چند دیگر حضرات کے ساتھ مل کر بارہ مولہ میں ایک درس گاہ مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کی تھی یہ درس گاہ کئی برسوں تک فعال رہی جس میں مولانا انور شاہ تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۳۲۲ ہجری میں خواجہ صاحب نے گڑھی حبیب اللہ کے مردان علی خاں کے ہمراہ حج کیا اور اسی دوران وہ طرابلس، بصرہ، مصر وغیرہ کے علماء سے ملے اور تبادلہ افکار کیا خواجہ عبدالصمد ککرو انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے فعال رکن تھے خواجہ صاحب نے ہی اقبال کو اس انجمن سے آشنا کروایا تھا۔مولانا انور شاہ کاشمیری کا اقبال سے تعارف بھی خواجہ عبدالصمد ککرو کے ذریعے ہی ہوا تھا۔مولانا خواجہ عبدالصمد بہترین مقرر تھے اور وہ اسلامی انجمنوں میں اپنی ذہانت کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔خواجہ عبدالصمد اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ان کی ایک فارسی نعت کے یہ اشعار سماعت فرمائیے:

شفاعت گر اہل جرم و خطاست　　که اوسرور اصل انبیا است
مقدم نشین صف مرسلین　　محمد شہ آسمان و زمین

بنور اول خاتم مرسلین فرستادہ احسن الخالقین
بہ پیش خدا شاہد جزو کل شفیع امم بادشاہ رسل

نشاط انصاری کے بقول مقبل کے تعلقات برصغیر کے متعدد ادیبوں اور شاعروں سے تھے جن میں مولانا ظفر علی خاں، حکیم اجمل خاں اور حسرت موہانی قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال کے تو وہ عقیدت مند، تھے چنانچہ ۱۹۰۳ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اٹھارہویں سالانہ جلسے میں جب اقبال نے اپنی مشہور نظم ''فریاد امت'' سنائی تو اس موقع پر عبدالصمد مقبل نے علامہ کو ایک نقرئی تمغہ پہنایا جو خواجہ صاحب کشمیر سے بنوا کر لائے تھے، ۱۹۱۱ء میں علامہ نے انجمن کے جلسے میں اپنی نظم ''شکوہ'' پڑھی تو خواجہ عبدالصمد ککرو تخلص مقبل نے جو جلسے میں موجود تھے ایک بیش قیمت کشمیری شال علامہ کو پیش کی اور فرط جذبات سے ان سے بغلگیر ہوئے۔ علامہ اقبال جب جون ۱۹۲۱ء میں کشمیر گئے تو خواجہ عبدالصمد ککرو انتقال کر چکے تھے مگر علامہ تعزیت کے لیے بارہ مولہ تشریف لے گئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اقبال ۱۹۰۳ء میں بھی عبدالصمد ککرو کے جواں سال بیٹے کی تعزیت کے لیے بارہ مولہ آئے تھے مگر یہ بات تحقیق طلب ہے۔ یہ مسلم ہے کہ جب اقبال کشمیر آئے تو عبدالصمد ککرو کے تعمیر کردہ بنگلے پر ٹھہرے تھے جو جھیل ڈل کے پانیوں پر تھا اور پھر اقبال نے وادی لولاب کی سیاحت کی تھی۔ اقبال کی نظم جو وادی لولاب کے بارے میں ہے چشم دید نظاروں کی آئینہ دار ہے۔

کشمیر کا شاعر، ادیب، مقرر اور مصلح خواجہ عبدالصمد ککرو پچاسی سال کی عمر پا کر جولائی ۱۹۱۹ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا، مقبل کا اردو فارسی کلام ابھی تک یکجا نہیں ہو سکا اور شاید اس کا بہت سا حصہ ضائع بھی ہو گیا ہو۔ ان کے بیٹے خواجہ عنایت اللہ ککرو نے کوشش کر کے اپنے والد سے متعلق دو کتابچے شائع کروائے تھے بنام اقبال اور خواجہ عبدالصمد ککرو اور برگ سبز۔ برگ سبز میں خواجہ مرحوم کی شاعری کا نمونہ دیا گیا تھا یہ دونوں کتابچے آج ناپید ہیں لیکن خواجہ عبدالصمد ککرو مقبل کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہا ہے اور رہے گا۔

صاحبزادہ حسن شاہ

صاحب زادہ محمد عمر کا نام ان کی شہرہ آفاق کتاب ''نانک ساگر'' کی وجہ سے مشہور ہے۔ جب ملک راج صراف نے ریاست جموں وکشمیر کا اولین اخبار ''رنبیر'' ۱۹۲۴ء میں جاری کیا تو صاحبزادہ محمد عمر ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اس اخبار میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ صاحبزادہ پیشے کے اعتبار سے جج تھے۔ آپ کے دو بیٹے تھے اور دونوں آفتاب و ماہتاب۔ صاحبزادہ محمود امر سنگھ کالج سرینگر کے پرنسپل رہے پھر ڈائریکٹر ریسرچ میوزیم تعینات ہوئے۔ میں اس وقت محمد عمر صاحب کے دوسرے فرزند جناب صاحبزادہ حسن شاہ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

صاحبزادہ حسن شاہ ۱۹۱۳ء میں جموں میں جولاہ کے محلے میں پیدا ہوئے۔ صاحبزادہ حسن شاہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایس پی کالج سرینگر میں تاریخ کے پروفیسر تعینات ہوئے۔ آپ طلبہ میں تاریخ وتمدن کا شعور اور تحقیق کی لگن پیدا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے، آپ جہاں ایک شفیق استاد تھے وہاں سچے محنتی اور ذہین محقق بھی تھے۔ وہ برسوں تک محکمہ ریسرچ کے نگران رہے اور اس دوران انہوں نے تاریخ کشمیر سے متعلق نادر ونایاب نسخے وادی کے طول وعرض سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیے۔ انہوں نے ریسرچ لائبریری کو ایک علمی وتحقیقی کتب خانہ بنانے میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ آپ نے قلمی کتابوں کی نقول کے لیے مائیکروفلم مشین منگوائی اور دنیا بھر سے کشمیر سے متعلق قلمی نسخے لائبریری میں جمع کرائے، انہیں کی مساعی سے کشمیری زبان کا نیا املا اور رسم الخط مقرر ہوا۔ صاحبزادہ حسن محض خشک محقق نہ تھے بلکہ شعروشاعری سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں سرینگر میں اردو کا یادگار مشاعرہ آپ ہی کی نگرانی میں منعقد ہوا تھا جس میں جوش فراق، سلام مچھلی شہری جیسے مشاہیر شعراء نے شرکت کی، صاحبزادہ حسن شاہ نے محکمہ تحقیق واشاعت سے وابستہ ہو کر بے شمار علمی وادبی کام انجام دیئے، آپ ۱۹۵۴ء میں پرنس آف ویلیز کالج جموں میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے تو آپ کی کوششوں سے قلمی نسخوں کی تعداد تین ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

آپ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے کشمیر کی مشہور فارسی تاریخ ''تاریخ حسن'' کی چار جلدیں ایڈٹ کر کے شائع کیں، یاد رہے کہ ''تاریخ حسن'' کشمیر کے معروف مورخ پیر حسن کھوئی ہامی کی تالیف ہے جو تاریخ کا مستند ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ مولوی محمد ابراہیم اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ جو چیز شاہ صاحب کی تاریخ میں بالغ نظری کو اجاگر کرتی ہے وہ ''تاریخ حسن'' جلد اول کے شروع میں بزبان انگریزی ان کا عالمانہ مقدمہ ہے۔ اس مقدمہ سے تاریخ کشمیر سے متعلق ان کی گہری اور عمیق و وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ادبی و علمی خدمات کے حوالے سے آپ کا ایک بڑا کام وہ تصنیف بھی ہے جو ''مطالعہ معاشرت'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ صاحبزادہ حسن شاہ میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ بااصول آدمی تھے اور اعلیٰ کردار کے مالک بھی۔

صاحبزادہ حسن شاہ پاکستان کے حامی تھے اس لیے آپ ۱۹۶۵ء کے بعد اسلام آباد آ گئے. یہاں آپ نے رجسٹرار کی حیثیت سے قائداعظم یونیورسٹی میں خدمات کا آغاز کیا جب یونیورسٹی کا کیمپس سیٹلائٹ ٹاؤن میں تھا۔ آپ نے اس نوزائیدہ یونیورسٹی کو صحیح بنیادوں پر استوار کرنے میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔ صاحبزادہ صاحب کچھ عرصہ پشاور یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہے۔

میں ذاتی طور پر صاحبزادہ حسن شاہ صاحب کا اس لیے بھی ممنون و مداح ہوں کہ میں جب ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹریٹ کرنے کے لیے عازم ایران ہو رہا تھا تو آپ نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اپنی نصیحتوں سے نوازا اور مقالے کے لیے فرمایا کہ میں کشمیر کی اولین تاریخ راج ترنگنی کا فارسی ترجمہ ایڈٹ کروں چنانچہ میں نے تعمیل ارشاد میں یہ ترجمہ ایڈٹ کیا صاحبزادہ حسن شاہ قدم قدم پر میری رہنمائی فرماتے رہے جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں ان کا خوشہ چین رہا ہوں:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

منشی محمد دین فوق

منشی محمد دین فوق کشمیریوں کی ڈار قوم سے تعلق رکھتے تھے۔فوق کے مورث اعلیٰ حسن ڈار افغانوں کے دور حکومت میں کشمیر سے پنجاب آ گیا تھا اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔فوق کے والد کا نام لدھا خاں تھا جو شعر وشاعری سے دلچسپی رکھتا تھا۔فوق کا بڑا بھائی رحیم بخش بھی شاعر تھا۔ فوق ۱۸۷۷ء میں کوٹلی ہرنرائن میں پیدا ہوئے جو سیالکوٹ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔فوق نے ابتدائی تعلیم جا مکے اور لاہور میں حاصل کی مگر مڈل سے آگے وہ نہ جا سکے،شروع میں فوق نے سیالکوٹ میں پٹواری کا کام سیکھا پھر اپنے والد کے ساتھ جموں چلے گئے مگر جلد ہی فیصل آباد آ گئے۔لاہور میں فوق کی ملاقات مولوی محبوب علی مدیر پیسہ اخبار سے ہوئی تو اس اخبار سے منسلک ہو گئے، آپ نے لاہور میں ۱۸۸۶ء میں مشاعرے کروانے شروع کیے۔ انجمن اتحاد کے زیر اہتمام ہفتہ وار مشاعرہ بھاٹی گیٹ میں کروانا شروع کیا۔ بزم قیصری کے اہتمام میں بھی مشاعرے ہونے لگے۔ مشعل سلطانپوری کے بقول فوق اور اقبال ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔اقبال کی دیکھا دیکھی فوق نے بھی کلام بغرض اصلاح داغ دہلوی کو بھیجنا شروع کیا۔ اس طرح فوق ۱۸۹۸ء میں داغ کے شاگرد ہو گئے،۱۹۰۱ء میں پیسہ اخبار کی ملازمت ترک کر کے اپنا اخبار "پنجہ فولاد" جاری کیا داغ نے اخبار کے اجراء پر مبارکباد دی اور کہا:

ہوا ہے پنجہ فولاد جاری
خریدارو نیا اخبار دیکھو

اقبال نے بھی داد دیتے ہوئے کہا:

نام ہے اس کا محمد دین فوق
عمر چھوٹی ہے مگر ہشیار ہے

۱۹۰۲ء میں لاہور کے ایک کشمیری میاں جان محمد گنائی نے فوق کی ادارت میں کشمیری گزٹ جاری کیا۔ یہ اخبار ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا اور پنجہ فولاد بھی زندہ نہ رہ سکا، چنانچہ اسی سال فوق نے کشمیری میگزین جاری کیا۔فوق نے اب سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ۱۹۰۹ء میں مسلم

کشمیری کانفرنس کی داغ بیل ڈالی اور فوق اس کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۳ء سے کشمیری میگزین ماہنامہ سے ہفت روزہ کر دیا گیا یہ اخبار ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ پھر فوق نے ۱۹۳۲ء میں ''کشمیر جدید'' کے نام سے ایک اخبار کی سرینگر سے اشاعت شروع کی۔

محمد دین فوق نے جس طرح صحافت میں لوہا منوایا اس طرح وہ ایک مصنف کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے۔ تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، ''تاریخ کشمیر'' ''اقوام کشمیر'' ''تاریخ بڈھاہی'' ''تاریخ اقوام'' ''جموں تاریخ سیالکوٹ'' ''تاریخ اقوام لداخ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری بھی ان کا میدان تھا۔ فوق نے ایک درجن تذکرے اور دو درجن سوانح عمریاں تالیف کی ہیں، مثال کے طور پر ''تذکرۃ الصالحین'' ''تذکرہ رہنمایان ھنود'' ''تذکرہ اخبار نویساں'' ''تذکرہ خواتین'' کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ سوانح عمریوں میں حضرت داتا گنج بخش، شمس تبریز اور مولانا روم کے نام ملتے ہیں مگر نہیں معلوم کہ تاریخ و سوانح کی یہ تصانیف اب دستیاب ہیں یا نہیں، فوق نے کشمیر اور کشمیریوں پر اس قدر لکھا ہے کہ اقبال نے ان کو مجدد کشامرہ کا لقب دیا تھا، فوق نے ۱۹۰۹ء میں مسلم کشمیری کانفرنس قائم کی۔ بعد میں اس کے بطن سے کشمیر کمیٹی نے ۱۹۳۱ء میں جنم لیا جس کے صدر علامہ اقبال بنائے گئے تھے۔

فوق ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ان کی شاعری کے دو مجموعے ''نغمہ گلزار'' اور ''آئینہ پیری'' شائع ہوئے۔ فوق نے ناول نویسی میں بھی مہارت دکھائی ہے۔ ان کے تیرہ ناولوں کے نام ملتے ہیں اور ان کی تصانیف کی تعداد ۹۰ بتائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فوق ۱۹۰۷ء کے بعد تادم حیات گرمیوں میں کشمیر جاتے رہے۔ وہ اکثر اوقات کشمیری کے شاعر مہجور کے ساتھ رہتے اور اپنے آبائی گاؤں زینہ گیر میں بھی رہائش رکھتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی صحت بگڑنے لگی۔ وہ ۱۹۴۵ء میں کشمیر گئے تو طبیعت اور بگڑ گئی۔ چنانچہ سرینگر سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئے۔ آخر کار ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو وفات پا گئے۔ سیماب اکبر آبادی نے تاریخ وفات کہی:

گفت	تاریخ	رحلتش	سیماب
انتزا	ع	مورخ	کشمیر

میں سمجھتا ہوں کہ فوق سب سے پہلا آدمی ہے جس نے اپنے ہم وطن اقبال کو عوام سے روشناس کرایا کہ جب وطن کا تقاضا یہی تھا، فوق ایک صحافی، شاعر، مورخ، سوانح نگار، ناول نویس

سماجی مصلح اور سیاسی رہنما تھا اور سب سے بڑا کر یہ کہ وہ عاشق کشمیر اور دلدادۂ جنت نظیر تھا۔

آخر میں اس نابغہ روزگار فرزند کشمیر کے یہ اشعار سنیے:

آخری وقت ہے آ جاؤ عیادت کے لیے
جانب ملک عدم جاتے ہیں جانے والے
مدہم سی روشنی تھی چراغ حیات میں
اے باد مرگ تو نے اسے بھی بجھا دیا
کشمیر ہے اک شیر مگر سویا ہوا ہے
جاگے گا تو مشکل سے وہ جائے گا سنبھالا

نندلال کول طالب

کشمیر کے پنڈت فارسی کے ماہر رہے ہیں۔ سلطان بڈھ شاہ کے دور رواداری میں سرکاری دفاتر اور اداروں میں ان کا بڑا اثر ورسوخ تھا کیونکہ وہ فارسی کے عالم اور فارسی میں خط وکتابت کے فن سے آشنا تھے اسی لیے یہ لوگ کارکن کہلاتے تھے۔ مسلمانوں اور کشمیری پنڈتوں میں اس قدر فکری ہم آہنگی رہی ہے کہ تاریخ کشمیر میں ایک واقعہ بھی پیش نہیں کیا جا سکتا جب مسلمانوں اور پنڈتوں میں کبھی کوئی جھگڑا ہوا ہو بعد کے ادوار میں پنڈتوں نے اردو کو فروغ دیا اور اس گروہ سے ایسے ایسے باکمال پنڈت شاعر وادیب پیدا ہوئے جن پر فخر کیا جاتا رہا ہے۔

پنڈت نندلال کول طالب کشمیر میں فارسی اور اردو کے معروف شاعر وادیب تھے۔ طالب ۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے دادا دیوہ کاک بہترین خوشنویس تھے اور موسیقی ومصوری میں مہارت رکھتے تھے۔ طالب کے والد پنڈت ٹھاکر پرشاد کو بھی شعر وادب سے دلچسپی تھی۔ طالب نے فارسی اور اردو میں ایم اے کیا اور کالج میں پروفیسر رہے۔ وہ کلچرل اکادمی کے شعبہ لغت سازی سے بھی وابستہ رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا، طالب نے ۱۹۱۲ء میں اپنا کلام اخبارات میں شائع کرانا شروع کیا اور لاہور کے اخبارات ''بہار کشمیر''، ''صبح کشمیر'' اور ''گلشن'' میں چھپتے رہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے ''رشحات التخیل'' اور ''مرقع افکار'' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئے۔ وہ اصلاح سخن علامہ کیفی سے لیتے تھے جو کشمیر کی حکومت میں اسسٹنٹ فارن سیکرٹری کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ پنڈت نندلال کول طالب کے مراسم اپنے عہد کے مشاہیر کے ساتھ بہت گہرے اور دوستانہ تھے جن میں خلیفہ عبدالحکیم، مولوی عبدالحق ساحر دہلوی، چوہدری خوشی محمد ناظر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ قابل ذکر ہیں، علامہ سیماب اکبرآبادی، تلوک چند محروم، سر عبدالقادر اور چکبست جیسے نابغہ روزگار طالب کے کلام کے مداح تھے۔

طالب غزل، نظم اور رباعی کا شاعر تھا اور وہ کشمیر کا پہلا شاعر تھا جس کا کلام زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ طالب کی شاعری پر مولوی عبدالحق کا یہ تبصرہ دیکھیے لکھتے ہیں: ''مجھے فی الحقیقت تعجب ہے کہ آپ نے وادی کشمیر میں رہ کر اردو زبان پر ایسی قدرت کیونکر حاصل کر لی۔

طالب کشمیری کا دوسرا مجموعہ کلام ''مرقع افکار'' کے نام سے چھپا ہے جو دراصل ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، یہ نظمیں ادب ولطیف، ادبی دنیا، چمنستان زمانہ اور شاعر ایسے بلند پایہ ادبی مجلات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ پروفیسر برج پریمی نے لکھا ہے کہ خیال کی وسعت بیان کی متانت اور زبان کی برجستگی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ نظمیں سیاسی، سماجی اور مذہبی موضوعات کو سمیٹتی ہیں۔ کلام میں سوقیت اور ابتذال نہیں پایا جاتا۔ تنہائی، عورت، نور جہاں، مذہب مرزا غالب ان کی چند مشہور نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔

نندلال کول طالب کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ انہوں نے جائزہ کلام غالب کے نام سے کلام غالب کا وقیع جائزہ پیش کیا ہے اور للہ عارفہ کے کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ جائزہ کلام غالب طالب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو نوائے ادب بمبئی میں برسوں تک شائع ہوتے رہے۔ یہ تصنیف غالبیات میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ طالب بقول برج پریمی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، وہ اردو شاعری کے توسط سے کشمیر کے شاعرانہ ذہن اور کشمیریوں کی اردودانی کی شناخت کرانے والے پہلے بلند مرتبت شاعر تھے جن کا کلام بلاغت نظام سارے ملک کے اردودان طبقے میں قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

پروفیسر طالب کی غزلوں اور نظموں سے یہ چند اشعار سماعت فرمایئے۔ یہ ان کے رنگ تغزل اور حسن بیان کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

چاروں طرف نمایاں نور خدا ہے مجھ کو
گو ظاہراً بتوں پر قربان ہو رہا ہوں
یہ ڈر لگتا ہے خم آئے نہ تیری تیغ میں قاتل
نہیں پروا مجھے اس کی کہ میرا دم نکلتا ہے
بچپن کا ایک رفیق تھا اب وہ بھی چھٹ گیا
دل میرا آشنا ہے نہ میں آشنائے دل

اور اب نظم کا رنگ ڈھنگ

پھول میں ہے رنگ و بو اور ہے موتی میں آب
برق میں اک اضطراب باعث صد انقلاب
نغمے سناتا ہوا جلوہ دیدار ہے

پریم ناتھ بزاز

پریم ناتھ بزاز ۱۹۰۵ء میں کشمیر کے دارالحکومت سرینگر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ایس۔ پی کالج سرینگر سے بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۵ء میں ہری سنگھ کی حکومت میں ملازمت اختیار کر لی، چونکہ آپ آزادی پسند اور غلامی کے خلاف تھے، اس لیے ۱۹۳۰ء میں ملازمت چھوڑ دی اور سیاست میں آ گئے۔ بزاز نے ۱۹۳۲ء میں وتستا کے نام سے اردو اخبار جاری کیا جو وادی میں اردو کا پہلا اخبار تھا۔ بزاز نے ۱۹۳۵ء میں ایک اور اردو اخبار ''ہمدرد'' جاری کیا آپ ایک منفرد اسلوب کے صحافی تھے۔

بزاز ایک بیباک سیاستدان، ایک زیرک صحافی اور ایک ہمدرد قوم مصنف تھا۔ وہ کشمیری کے علاوہ اردو اور انگریزی پر کامل تسلط رکھتا تھا۔ انگریزی میں بزاز کی مشہور کتاب ''ان سائڈ کشمیر'' ہے جس میں ایک ادیب کے بقول کشمیریوں کے ابھرتے اور مچلتے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ بزاز کی ایک اور اہم تاریخی دستاویز ''تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر'' ہے۔ اس کتاب میں بزاز نے کشمیریوں کی زبوں حالی کا رونا رویا ہے۔ بزاز کی ایک انگریزی تصنیف آزادی کشمیر ہے جس کا اردو ترجمہ مرحوم عبدالحمید نظامی نے کیا ہے۔ اس کتاب میں پریم ناتھ بزاز نے ڈوگرہ سامراج کے خلاف کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی تفصیل بیان کی ہے۔

بزاز کشمیر کی سبھی قوموں کا پسندیدہ رہنما تھا۔ اس نے وطنیت کی سطح پر کشمیری عوام کو متحد کر کے آزاد ہونے کا درس دیا۔ پریم ناتھ اپنے نام کی طرح پریم اور محبت کا پرچارک تھا۔ وہ ہندو ہونے کے باوجود ہندوؤں کی غلامی کے خلاف لڑتا رہا۔ وہ کشمیر کے ہر باشندے کا ترجمان او رہر مظلوم کا غمخوار تھا۔ اس کے سینے میں ایک سچے ہمدرد قوم کا دل دھڑکتا تھا۔ پریم ناتھ بزاز کو پوری طرح احساس تھا کہ ریاست کشمیر کا کسان اور مزدور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مظالم کا شکار ہے اور اسے زندگی کے وسائل میسر نہیں ہیں، یہی احساس تھا جس کے تحت بزاز نے

۱۹۴۵ء میں کشمیر میں کسان مزدور کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اسی کانفرنس میں جس کا اجلاس ۱۲ مئی ۱۹۴۷ء کو اننت ناگ میں منعقد ہوا۔ لفظ آزاد کشمیر استعمال ہوا۔

دوسری طرف منفی قوتیں اور ڈوگرہ شاہی کے گماشتے بزاز کی چلائی ہوئی تحریک کے خلاف کام کر رہے تھے، غلامی کی تاریکیوں میں رہنے والے لوگ آپ کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۷ء کو بزاز پر قاتلانہ ہوا لیکن قدرت نے آپ کو بچالیا۔

بزاز بدستور اپنی مخصوص شجاعت، قابلیت اور معاملہ فہمی سے قوم کی قیادت کرتے رہے اور پاکستان کے حق میں تحریک چلاتے رہے۔ ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو بزاز کی سیاسی اور سماجی جماعت ''کسان مزدور'' کانفرنس نے الحاق پاکستان کی قرارداد منظور کی جو تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ پریم ناتھ بزاز کشمیر کا بہت بڑا صحافی، ملت کشمیر کا عظیم ہمدرد اور بہی خواہ اور پاکستان سے کشمیر کے الحاق کا زبردست حامی تھا۔ اس کا اخبار ''ہمدرد'' کشمیر میں اتنا ہی مقبول اور موثر اخبار تھا جتنا پنجاب میں ''زمیندار'' تھا۔ ''ہمدرد'' نے کشمیر میں اردو صحافت کو ایک لائن دی اور رائے عامہ کو ہموار کیا۔ بزاز نے نہ صرف اپنی کمیونٹی کی ترجمانی کی بلکہ وہ انسانی سطح پر ڈوگرہ غلامی کے خلاف متحرک رہا۔ اس کی تحریریں اور تقریریں قوم کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ وہ پڑھے لکھے کشمیریوں کا ہی رہنما نہ تھا بلکہ ان پڑھ کسانوں اور سادہ لوح مزدور کا لیڈر بھی تھا۔ بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ بزاز کی چلائی ہوئی تحریک بیکار نہیں گئی اور اس کی صدا صحرا میں صدا نہ تھی اس کی آواز درباروں میں سنی گئی اور بازاروں میں سنائی دی۔

پریم ناتھ بزاز اپنے ایک مضمون میں جو ہفت روزہ ''نصرت'' لاہور کے کشمیر نمبر میں فروری ۱۹۶۰ء کو شائع ہوا لکھتا ہے:

''کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ہمیں حقائق اور تازہ تبدیلیوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کشمیر مسلم اکثریت کا خطہ ہے، زیادہ تعداد کے ان باشندوں کا جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور تمدنی رشتہ پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستان کے ساتھ نہیں، قدرتی طور پر کشمیر کو پاکستان کے ساتھ اپنا ناطہ استوار کرنا چاہیے بھارت کے ساتھ نہیں۔''

مورخ کشمیر۔ جی۔ ایم میر

ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ، جغرافیہ، اقوام، مذاہب اور تہذیب و تمدن پر لکھنے والوں کی تعداد سینکڑوں میں نہیں ہزاروں میں ہے۔ سنسکرت، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں میں قدیم ادوار سے لے کر آج تک اس خطہ گل ولالہ کے ہر پہلو کو اجاگر اور ہر نقش کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کشمیر پر بادشاہوں نے بھی لکھا ہے اور سیاحوں نے بھی قلم فرسائی کی ہے۔ شاعروں نے بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ادیبوں نے بھی مداح سرائی کی ہے۔ آج جہاں جموں و کشمیر کے مورخین جنت نظیر کی تاریخ قلمبند کر رہے ہیں وہاں آزاد کشمیر کے محب وطن بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان بے شمار مورخوں میں ایک نام جی۔ ایم میر کا بھی ہے جنہوں نے کشمیر کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور وہ عہد شباب سے لے کر آج دور پیری تک تاریخ کشمیر کو ایک مشن کے طور پر زندہ رکھنے کی سعی کرتے چلے آ رہے ہیں۔

جی۔ ایم میر نے کشمیر کی محبت کو مذہب اور آزادی کشمیر کو زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے، کشمیر ان کے دل میں آباد اور ان کے ذہن پر حاکم ہے۔ جی۔ ایم میر ایک ایسا سچا وفادار اور جان نثار فرزند کشمیر ہے جو نہ صرف تحریک آزادی کشمیر کے ہراول دستے میں شامل ہے بلکہ وہ آب ولر کے گوہر ہائے یکدانہ کی چمک سے دنیا کو مسحور و مسرور کر رہے ہیں۔

جی۔ ایم میر ایک بالغ نظر مورخ بھی ہے اور ایک ماہر آثاریات بھی، وہ ایک عالم مذاہب بھی ہے اور تہذیب و تمدن کا سکالر بھی، وہ کشمیر کے جغرافیہ سے بھی کما حقہ واقف ہے اور اردگرد کے ممالک کے خدوخال بھی جانتا ہے۔ ایک انسان دوست، امن پسند، آزادی خواہ، محب وطن اور دانشور ہونے کے ناطے جی۔ ایم میر ملک اور بیرون ملک جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

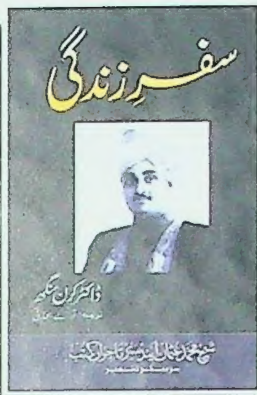
کشمیر اور اس کے متعلقات پر جی۔ ایم میر کی کوئی نصف درجن سے زیادہ نہایت تحقیقی اور اہم کتابیں مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔ ان تصانیف نے نئے حقائق سے ہمیں روشناس کرایا ہے بلکہ

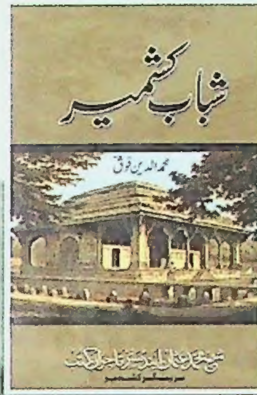
میں تو کہوں گا کہ انہوں نے اس میدان میں انکشافات کیے ہیں۔ جی۔ ایم میر ایک ایسا مورخ ہے جس نے تاریخ کشمیر کو سائنٹیفک بنیادوں پر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ''کوہستان قراقرم سے بحر قزوین تک'' میں جی۔ ایم میر کشمیر کے ان گونا گوں سیاسی، تمدنی اور اقتصادی روابط کا ذکر کرتے ہیں جو روابط ایشیائی ممالک نے کشمیر سے استوار کر رکھے ہیں۔ چھ ابواب پر مشتمل یہ تاریخ جدید انداز فکر اور دلائل کے تحت تحریر ہوئی ہے اور اس میں علامہ اقبال کے اس ارشاد کی تائید تاریخی حقائق ودلائل سے کی گئی ہے کہ ''کشمیر دراصل وسط ایشیا کا حصہ ہے جب تک وسط ایشیا بیدار نہیں ہوگا۔'' مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مذہب اسلام فارسی زبان، تصوف، علم تہذیب، صنائع غرض یہ کہ ہر چیز کشمیر میں ان ممالک سے آئی ہے جسے کل ترکستان اور آج سنٹرل ایشیا کہا جاتا ہے۔

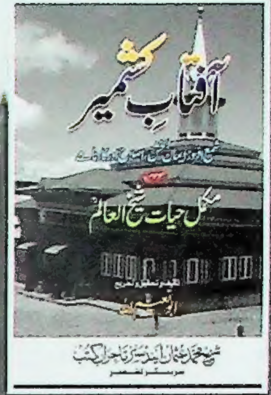
کشمیر چین کا ہمسایہ ہے اور اس ملک کے سیاسی وثقافتی روابط کشمیر سے قبل مسیح سے رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ کتاب کے کل گیارہ ابواب ہیں جن میں چین وکشمیر کے رشتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ خاص طور پر وہ باب بہت اہم ہے جو کشمیر میں بدھ مت کی آمد اور اس کے عروج کی داستان بیان کرتا ہے۔

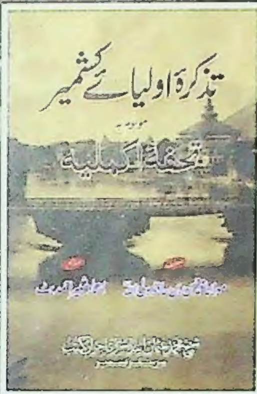
قابل توجہ یہ انکشاف ہے کہ کشمیری الاصل بدھ مبلغین نے چین میں جا کر اس دھرم کا پرچار کیا۔ جی۔ ایم میر کی ایک اور قابل ذکر تصنیف ''کشور کشمیر'' ہے جس میں پانچ ہزار سال کی تاریخ کشمیر تحریر ہوئی ہے۔ ۲۷ ابواب پر مشتمل یہ تاریخ سکندر اعظم کے حملہ کشمیر (۳۲۷ ق م) سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کی داستان سناتی ہے۔ جی۔ ایم میر نے یہ تین کتابیں لکھ کر کشمیر کی تاریخ کے افقی اور عمودی زاویوں کو روشن کیا ہے۔ بالفاظ دیگر ان کی تاریخ میں وسعت بھی اور رفعت بھی پھیلاؤ بھی ہے اور گہرائی بھی۔ انہوں نے ''تاریخ کشمیر'' کو موضوع تحقیق بنا کر اور انکشافات کر کے اپنے لیے مورخین کی صف اول میں جگہ بنالی ہے۔ علامہ اقبال نے محمد دین فوق کو مجدد کشامرہ کا لقب دیا تھا۔ میں جی۔ ایم میر کو اکیسویں صدی کا مجدد کشامرہ سمجھتا ہوں۔ ہر سمجھدار آدمی سمجھے گا کہ میرا ایسا سمجھنا بلا دلیل اور بے جواز نہیں ہے۔



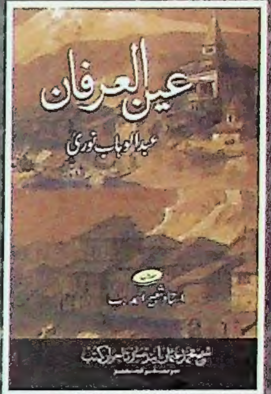


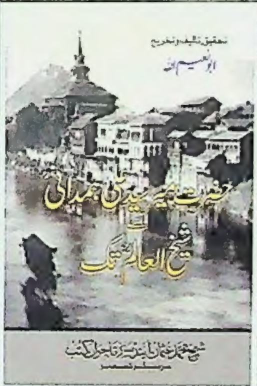


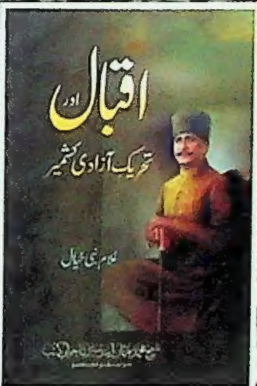


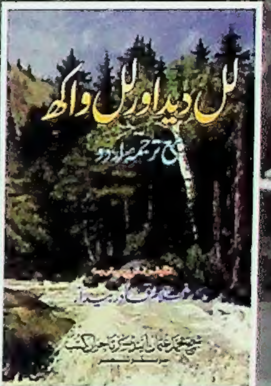














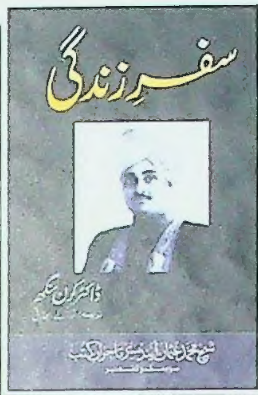
SHEIKH MOHAMMAD USMAN & SONS

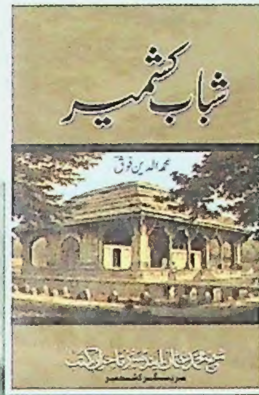
Residency Road Srinagar-190001, Kashmir
Madina Chowk Gow Kadal, Srinagar-190001, Kashmir
www.gulshanbooks.com chairmangulshan@gmail.com

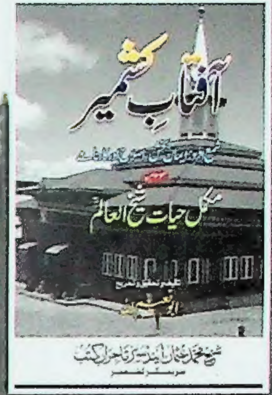
ISBN: 978-81-8339-477-2

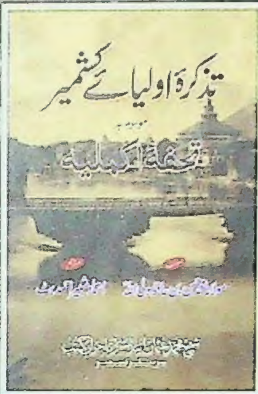


Rs. 295/=



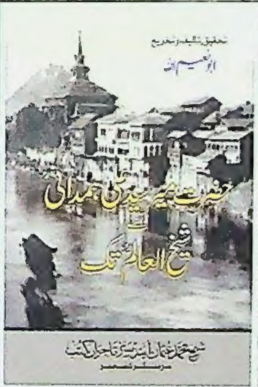


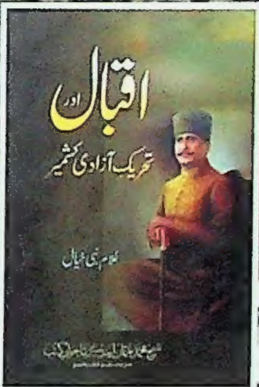


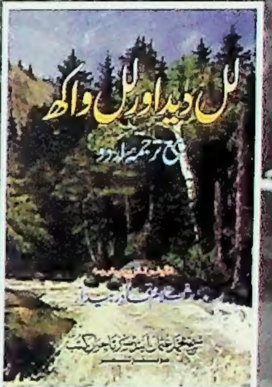














SHEIKH MOHAMMAD USMAN & SONS
Residency Road Srinagar-190001, Kashmir
Madina Chowk Gow Kadal, Srinagar-190001, Kashmir
www.gulshanbooks.com chairmangulshan@gmail.com

ISBN: 978-81-8339-477-2



Rs. 295/=